مروجہ بدعات

فقہاء اسلام کی نظر میں

جس میں قرآن وحدیث کے ارشادات اور محدثین فقہاء اور صوفیاء کے فرمودات کی روشنی میں بدعت اور بدعتی کے احکام، نیز بدعت کی حقیقت اور اعتقادی وعملی مروجہ بدعات کے متعلق مستند فقہاء کی آراء آسان زبان میں اختصار کے ساتھ معہ حوالہ جات ذکر کی گئی ہیں۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

(شیخ الحدیث دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد)

پیش لفظ: سید اکبر الدین قاسمی

تقریظ: شیخ الحدیث مولانا صدیق احمد صاحب باندوی

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ

437 ڈی گارڈن ایسٹ، نزد لسبیلہ چوک۔ کراچی، پاکستان

فون: 7216488 فیکس: 7223688

برانچ: طیب ملی بلڈنگ۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 2629157

مروّجہ بدعات

فقہاء اسلام کی نظر میں

جس میں قرآن وحدیث کے ارشادات اور محدثین فقہاء اور صوفیاء کے فرمودات کی روشنی میں بدعت اور بدعتی کے احکام، نیز بدعت کی حقیقت اور اعتقادی و عملی مروجہ بدعات کے متعلق مستند فقہاء کی آراء آسان زبان میں اختصار کے ساتھ معہ حوالہ جات ذکر کی گئی ہیں۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

(شیخ الحدیث دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد)

پیش لفظ: مولانا سید اکبرالدین قاسمی

تقاریظ: شیخ الحدیث مولانا صدیق احمد صاحب باندوی

ناشر

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ

۴۳۷/ ڈی گارڈن ایسٹ نزد لسبیلہ چوک کراچی فون: 7216488 فیکس: 7223688

برانچ آفس: ☆ اردو بازار فرسٹ فلور بالمقابل فضل الرحمٰن اسکول کراچی فون: 2629157

باہتمام.............. فہیم اشرف نور
طبع دوم.............. مارچ ۲۰۰۳ء

ملنے کا پتہ

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ

۴۳۷/ ڈی گارڈن ایسٹ نزد لسبیلہ چوک کراچی ۵
فون: ۷۲۱۶۴۸۸ فیکس/فون: ۷۲۲۳۲۸۸
برانچ آفس☆ اردو بازار فرسٹ فلور گڈوانی بلڈنگ کراچی فون: ۲۶۲۹۱۵۷
☆ H-8/1 اسٹریٹ 3 مقابل الشفاء انٹرنیشنل ہسپتال اسلام آباد

☆ دیگر ملنے کے پتے ☆
☆ دارالاشاعت اردو بازار کراچی ☆ ادارۃ المعارف دارالعلوم کراچی
☆ بیت القرآن اردو بازار کراچی ☆ بیت العلم۔ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
☆ صدیقی ٹرسٹ المنظر لسبیلہ چوک کراچی ☆ بیت الکتب، گلشن اقبال نمبر۲۔ کراچی
☆ ادارہ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور ☆ بیت العلوم نابھہ روڈ پرانی انارکلی لاہور
☆ مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار لاہور ☆ مکتبہ رحمانیہ اقراء سینٹر اردو بازار لاہور
☆ یونیورسٹی بک ایجنسی قصہ خوانی پشاور ☆ مکتبۃ المعارف جنگی قصہ خوانی پشاور
☆ کتب خانہ رشیدیہ راولپنڈی ☆ ادارۃ القرآن H-8/1 اسلام آباد
ملک کے دیگر اہم کتب خانے

فہرست مضامین

کلمۂ صادقہ

راقم الحروف نے عارف باللہ حضرت مولانا صدیق احمد صاحب باندوی دامت برکاتہم کو اس کتاب کا مسودہ بھیجا تھا، مولانا موصوف اہلیہ کی وفات اور بعض اسفار کی وجہ سے بہت مصروف اور سفر کے لئے پابہ رکاب تھے، اس لئے پیشِ لفظ تحریر نہ کر سکے، مگر جوابی مکتوب کے ذریعہ حوصلہ افزائی فرمائی، تبرکاً اسی مکتوب کو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے ——— رحمانی۔

عزیزم مولانا خالد سیف اللہ صاحب مدظلہ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کی کتاب اجمالی طور پر دیکھی، اللہ تعالیٰ اس کو نافع بنائے۔

اللہ پاک نے آپ کو جس قسم کی صلاحیت عطا فرمائی، یہ ان کا انعام ہے، اس سے کام لیجئے اور کوشش کیجئے کہ لوگ آپ کی ہر تحریر سے مستفید ہوں، اس وقت سفر پر روانگی کیلئے تیار ہوں بہت مصروف ہوں، بات تک کرنے کی فرصت نہیں ہے۔ احقر آپ کے لئے دعا کرتا رہتا ہے، آپ میرے لئے دعا فرماتے رہیں۔

والسلام

صدیق احمد غفرلہ

خادم جامعہ عربیہ، ہتوڑا

ضلع باندہ۔ یوپی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

اسلام ایک ہمہ گیر اصولوں اور جامع ترین نظامِ زندگی کا نام ہے۔ جس طرح آسمان کی وسعت زمین کے دامن کا تمام تر احاطہ کرلی ہے اسی طرح اسلامی تعلیمات کا سایہ انسانی زندگی کے سر پر مکمل طور پر حاوی ہے، چاہے انفرادی عمل ہو یا اجتماعی سرگرمی، عبادت کے طور وطریق یا معاشرت کا انداز، گھریلو خانگی معاملہ ہو یا قومی سماجی مسئلہ، تجارت ہو یا سیاست، عفو و درگذر کی بات ہو یا تعزیری احکام کا نفاذ کوئی رخ یا پہلو ایسا نہیں ہے جہاں اسلام نے ہماری دست گیری نہ کی ہو اور ہمیں راہِ ہدایت سے روشناس نہ کرایا ہو، چنانچہ طہارت اور پاکی حاصل کرنے کا طریقہ سمجھانے والے رہبرِ اعظم ؐ پر چند مشرکین کی جانب سے استہزاء کیا گیا کہ تمہارے نبی تم کو طہارت کا طریقہ بھی بتاتے ہیں تو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے بڑی مسرت اور شکر کے جذبات کے ساتھ یہ بات کہی کہ ہاں! ہمارے رسول ؐ نے ہمیں طہارت کا طریقہ بھی بتایا ہے یعنی ہمیں کسی معاملہ میں بے راہ نہیں چھوڑا۔

یہ اللہ کا احسانِ عظیم ہے کہ ہم ایسے مذہب کے ماننے اور عمل کرنیوالے ہیں جو معمولی مسئلہ سے لیکر زندگی کے عظیم سے عظیم تر مسائل میں ہماری رہنمائی کرتا ہے، لیکن بُرا ہو انسان کے ازلی دشمن شیطان کا کہ اس نے انسانوں کو گمراہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، عبادت گذاروں کو معاملات میں دھوکہ دیتا ہے،

نیکوکاروں کو ریا کی بیماری لگا دیتا ہے، انفاق کرنے والوں کو بدنی عبادت سے بے نیاز بنا دیتا ہے، حسن نیت کے ساتھ اگر عملِ صالح ہو رہا ہو تو اقامت سے دور کر دیتا ہے، الغرض کسی بھی تدبیر اور حربہ سے انسانوں کو راہِ راست سے ہٹانے کی مکمل کوشش جاری رکھتا ہے، اس کی انہی گمراہ کن کوششوں میں ایک کامیاب کوشش یہ ہے کہ ان اعمال و اطوار کو جن کا اسلام سے کوئی رشتہ اور تعلق نہیں، ایسا بنا کر پیش کرتا ہے گویا کہ وہ دینِ اسلام ہی سے متعلق اعمال ہیں، جس طرح کھیت میں کاشتہ پودوں کے ساتھ کچھ خودرَو پودے بھی اُگ آتے ہیں جو بظاہر کھیت ہی کا حصہ معلوم ہوتے ہیں حالانکہ وہ پودے اصل پودوں کے لئے نقصان دہ ہوتے ہیں کہ زمین کی افزائشی تاثیر و قوت تقسیم ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں کاشتہ پودے بے ثمر یا کم ثمر رہ جاتے ہیں، چنانچہ ان خودرَو پودوں کو نکالنا ضروری ہوتا ہے، اسی طرح اسلامی تعلیمات کے درمیان شیطان کی کچھ ایجادات بھی رونما ہو جاتی ہیں جن کو اصطلاحِ شریعت میں "بدعت" کہا جاتا ہے، اس کی ایسی کامیاب سازش ہوتی ہے کہ ان بدعات کو اتنے خوبصورت انداز میں پیش کیا جاتا ہے کہ اس کے چاہنے والے حقیقی اسلامی تعلیمات کے مقابل میں ان کو زیادہ درجہ دیتے ہیں جبکہ ان خودرَو اعمال سے اجتناب کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ خودرَو پودوں کو کھیت سے علٰحدہ کرنا۔

ہندوستان بلکہ برصغیر کے ہر حصہ میں مختلف بدعات اور خرافات مروّج ہیں اور بعض کم علم ان پر قرآن و حدیث کا لیبل لگا کر بھرپور وکالت بھی کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں کم فہم معصوم مسلمان ان کو دینِ اسلام کا ایک اہم حصہ سمجھ کر نہ صرف ان پر عامل ہوتے ہیں بلکہ اتنا اصرار و التزام کرتے ہیں جتنا دین کے بنیادی احکام کا بھی لحاظ نہیں کیا جاتا اور اگر کوئی ان پر عمل پیرا نہ ہو تو وہ ہر قسم کے سب وشتم کا نشانہ بن جاتا

ہے اور اس کے لئے دشمنِ رسولؐ اور خارج از اسلام کے فتوے بھی دینے سے گریز نہیں کیا جاتا ہے۔

بڑی مسرت کی بات ہے کہ ہمارے شہر کے ایک نوجوان فاضل محترم جناب مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (فاضلِ دیوبند) صدرالمدرسین دارالعلوم سبیل السلامؒ جن کو اللہ تعالیٰ نے علم و فقہ میں ممتاز مقام عطا فرمایا ہے اور جنہوں نے اپنی فقہی خدمات کے سلسلہ میں اکابرِ امت سے خراجِ تحسین حاصل کیا ہے، جن میں قاموس الفقہ، جدید فقہی مسائل حصہ اول و دوم اور اسلام میں حلال و حرام جیسی بلند پایہ تصانیف ان کے فقہی بصیرت اور علمی مقام کا شاہکار ہیں۔ موصوف نے دورِ حاضر کی تمام مروجہ بدعات پر فقہی مراجع اور ائمہ کے اقوال کی روشنی میں اس انداز سے بحث کی ہے کہ حق کیا ہے؟ واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ قرآن و حدیث کے سلسلہ میں تو لوگ بقول علامہ اقبالؒ ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

کا رویہ اپناتے ہیں لیکن فقہاءِ امت کی عبارات اور ائمۂ عظام کے آراء و اقوال جو قرآن و حدیث کے ترجمان شارح ہیں، ان میں کسی قسم کی تاویل یا ذاتی تشریح نہیں چل سکتی، اس لئے مسائل پر گفتگو فقہاءِ کرام کے اقوال و آراء کو پیشِ نظر رکھ کر کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ یہ کتاب کئی خصوصیات کی حامل ہے جس کا اندازہ آپ کو اس کے مطالعہ سے ہوگا۔ مثلاً:

(۱) زبان سہل اور آسان رکھی گئی ہے۔

(۲) مسئلہ کو نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ اس طرح پیش کیا گیا کہ بے جا طوالت بھی نہ ہو اور بات مبہم بھی نہ رہے۔

(۳) اسلوب اور اندازِ بیان مجادلانہ اور مناظرانہ نہیں بلکہ مصالحانہ اور حکیمانہ ہے۔

(۴) ہر مسئلہ کی وضاحت کتب فقہ کی عبارت اور مراجع کے نوٹ کے اہتمام کے ساتھ کی گئی ہے۔

(۵) کتاب کی ترتیب میں چونتیس بیش بہا اور مستند معروف کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے جن کی تفصیل علیٰحدہ سے درج ہے، اس سے کتاب کی وقعت اور افادیت میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔

آخر میں یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤلف مکرم کو جزائے خیر دے اور ان کی تالیف لطیف کو اظہارِ حق کا ذریعہ بنائے، اگر اب بھی حق کسی پر واضح نہ ہو تو یہی کہا جائے گا ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ،

(اگر چمگادڑ کی آنکھیں دن کی روشنی کو نہیں دیکھتیں تو آفتاب کا کیا قصور؟)
اس کو تو بصیرت والے دل اور عبرت والی نگاہ کیلئے اللہ سے دعا مانگنی چاہئے۔

اللّٰھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ ـ اٰمین

اکبر الدین قاسمی

ابتدائیہ

اسلام مکمل دین ہے اور پیغمبرِ اسلام کی نبوت سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی ہے، آپ کی کوئی سنت نہیں جو خیر و فلاح سے خالی ہو اور خیر و فلاح کی کوئی بات نہیں جو آپ کے اسوۂ حسنہ میں موجود نہ ہو، اس لئے اب آپ کے لائے ہوئے دین پر نہ باعتبار تعداد کے کوئی اضافہ جائز ہے اور نہ باعتبار کیفیت کے کوئی زیادت ممکن ہے۔ جو شخص اس پر کچھ اضافہ کرتا ہے وہ اپنے عمل اور زبانِ حال سے دو باتوں میں سے ایک کا دعویدار ہے۔ یا تو وہ اپنے آپ کو عقل و فہم میں آپ سے فائق و برتر تصور کرتا ہے کہ (معاذاللہ) خیر و بھلائی کی بعض وہ باتیں جن کو سمجھنے سے خدا کے رسول قاصر رہے، اس نے اس کو پا لیا ہے۔ یا وہ آپ کو حقِ رسالت کی ادائیگی میں خائن و کوتاہ باور کرتا ہے کہ خیر کی بعض باتوں کو آپ نے چھپا لیا تھا اور خیانت کی تھی وہ اس سے پردہ اٹھا رہا ہے۔ امام دارالہجرت حضرت امام مالکؒ کے بقول: فقد زعم ان النبی خان الرسالۃ۔ (الموافقات ۶۴/۲)

اسی لئے اہلِ علم نے کفر کے بعد تمام معاصی کے مقابلہ بدعت کے بارے میں سخت گیر رویہ اختیار کیا ہے اور اس کی سخت مذمت کی ہے مگر افسوس کہ مسلمانوں کا بڑا طبقہ عملاً اسی گناہ میں مبتلا ہے اور حقیقی اسلام کو بدعات اور رسوم و رواج کی بیڑیوں میں جکڑ کر رکھ دیا گیا ہے۔ یہ بدعات دو طرح کی ہیں: اعتقادی اور عملی ——— عملی بدعات تو صرف بدعات کے قبیل سے ہیں لیکن اعتقادی بدعتیں تو کفر تک جا پہونچی ہیں اور بعض

توصریحاً کفر ہیں۔ فیا عجباہ ویا اسفاہ !!

یہ تحریر مناظرہ وجدل کے اسلوب سے گریز کرتے ہوئے دعوت ونصح کے طریق پر اور اسی نیت سے لکھی گئی ہے۔ اس میں اولاً بدعت کی تعریف کی گئی ہے۔ پھر اسی سلسلے میں بنیادی اصول ذکر کئے گئے ہیں۔ حسنہ اور سیئہ میں بدعت کی تقسیم کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر احادیثِ رسول اور آثارِ صحابہ اور سلفِ صالحین نیز مشائخ وصوفیاء کے اقوال بدعت کی حرمت ومذمت سے متعلق نقل کئے گئے ہیں، اس کے بعد معاشرہ میں معروف اور مروج اعتقادی اور عملی بدعات کو لیا گیا ہے اور الگ الگ عنوان کے ساتھ ان کی شرعی حیثیت واضح کر دی گئی ہے۔

اس موضوع کا حق تھا کہ ان بدعات کی رد میں کتاب و سنت کی تصریحات اور صحابہ و تابعین کے آثار نقل کئے جاتے مگر وائے افسوس کہ بعض لوگوں کی تاویل بے جا نیز کتاب و سنت کے سرچشمۂ صافی سے گریز نے راقمِ سطور کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ فقہی تصریحات ہی کو بنیاد بنائے۔ اس لئے کہ جو طبقہ بدعات کا وکیل بلکہ اس کا پر جوش محرک اور داعی ہے، وہ مقلد ہے اور فقہ کی زبان قانونی زبان ہونے کی وجہ سے اس قدر چست ہوتی ہے کہ اس میں تاویل کی گنجائش اکثر نہیں ہوتی۔ پس اگر ان کے سامنے خود ان کے مکتب فقہ کی صراحتیں رکھ دی جائیں تو اب ان کے لئے کوئی راہِ فرار باقی نہیں رہ جاتی۔ اسی لئے اس بات کا التزام کیا گیا ہے کہ ان مسائل پر فقہی اقوال وتصریحات ہی پیش کرنے پر اکتفا کیا جائے۔

اس کے علاوہ دو اور باتیں جن کا اس مختصر تحریر میں لحاظ رکھا گیا ہے، یہ ہیں کہ بات لمبی نہ ہو بلکہ حتی الوسع مختصر اور جامع ہو کہ طول نویسی کم خواندہ اور متوسط مطالعہ کے لوگوں کے لئے بار ہو جاتی ہے، مختصر تحریر کا پڑھنا بھی آسان ہوتا ہے اور ذہن میں محفوظ کرنا بھی۔ دوسرے عام فہم وآسان زبان اختیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ

معمولی تعلیم یافتہ لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں، راقم سطور نے "جدید فقہی مسائل" میں یہی اسلوب اختیار کیا ہے جس سے لوگوں کو بڑا نفع پہونچا اور بعض مشاہیر اہل علم نے اس طریق کی تحسین فرمائی۔

یہ اوراق ۲۳، ۲۴، ۲۵، رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ کی راتوں میں لکھے گئے ہیں رمضان المبارک کی برکتوں اور خصوصیت سے اس کے عشرۂ اخیر کی رحمتوں کے صدقہ عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے قبول عطا فرمادے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ

کاش! کچھ آنکھیں ہوں جو سُرمۂ بصیرت سے ہم کنار ہوں، کچھ دل ہوں جو خوفِ خدا سے معمور ہوں، کچھ متلاشیانِ حق ہوں جن کو حق و راستی کی جستجو بے چین رکھتی ہو، کچھ عشاقِ بارگاہِ نبوت ہوں جو اسوۂ محمدی کی قربانگاہ پر "آبائی رسوم و رواج" کو بھینٹ چڑھانے تیار ہوں اور کچھ طلبگارانِ آخرت ہوں جو دنیا کی متاعِ حقیر کے لئے سنتِ نبوی کے چشمۂ حیوان سے محرومی کے لئے تیار نہ ہوں، انشاء اللہ ایسوں کے لئے یہ کم سواد سطور بھی کافی ہوں گی۔

وَاللّٰہ الموفق والمستعان

خالد سیف اللہ رحمانی

شب ۲۷، رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بدعت

بدعت کا مادہ ب، د، ع ہے، جس کے معنی نمونۂ سابق کے بغیر کسی چیز کو وجود میں لانے کے ہیں۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کو "بدیع السموات والارض" کہا گیا ہے۔ قرآن میں ایک دوسرے موقع پر قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ فرمایا گیا ہے، یعنی میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں جس کی نظیر پہلے سے موجود نہ ہو، عربی زبان میں ایسے شخص کو جو کسی نئے طریقہ کا موجد ہو، کہا جاتا ہے ابتدع فلان بدعة، اسی طرح ایسی عمدہ چیز کو کہ جس کی عمدگی اور بہتری کی سابق میں نظیر نہ ہو، کہا جاتا ہے "هٰذَا اَمْرٌ بَدِيْعٌ"، شریعت کی اصطلاح میں بدعت کسے کہتے ہیں، اس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ بندوں کے افعال اور اقوال سے متعلق احکام تین طرح کے ہیں: ایک وہ جن کا کیا جانا مطلوب ہے۔ ان کو واجب یا مستحب کہتے ہیں، دوسرے وہ جن کا نہ کیا جانا مطلوب ہے، ان کو حرام یا مکروہ کہتے ہیں، تیسرے وہ جن کے کرنے کی بھی اجازت ہے اور چھوڑنے کی بھی، اسی کو اباحت کہا جاتا ہے ———— پھر جن چیزوں کا ترک کیا جانا اور چھوڑا جانا مطلوب ہے، وہ دو طرح کی ہیں: ایک وہ جو اپنی ذات کے اعتبار سے ممنوع ہوں اور دوسری باتوں سے قطعِ نظر بجائے خود ان کو چھوڑنے کا حکم دیا گیا ہے، دوسرے وہ جن کو چھوڑا جانا شریعت میں مطلوب ہے اور جن کی ممانعت اس لئے ہے کہ وہ حدود و قیود، کیفیات اپنی ہیئت و صورت، وقت و زمانہ کی تخصیص یا کسی نسبتاً کم اہم چیز کو زیادہ اہمیت دینے اور دواماً اس پر عمل کرنے کی وجہ سے شریعت کے ظاہری حکم کی مخالفت ہوتی

ہو، اسی صورت کا نام "بدعت" ہے، پس اب بدعت کی تعریف یوں کی جائے گی کہ وہ دین میں شریعت کے مشابہ ایسا خود ایجاد کردہ طریقہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور رضا جوئی میں مبالغہ مقصود ہو، امام شاطبی کے الفاظ میں: عبارة عن طريقة فى الدين مخترعة تضاهى الشرعية يقصد بالسلوك عليه المبالغة فى التعبد لله سبحانه۔[1]

لہٰذا وہ ایجادات واختراعات جن کا تعلق احکامِ دین سے نہ ہو بلکہ احکامِ دنیا سے ہو جیسے کارخانے، عمارتیں، مشینیں وغیرہ ان پر بدعت کا اطلاق نہیں ہوگا۔ خود ایجاد کردہ سے مراد یہ ہے کہ وہ چیزیں کہ عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں ان کی اصل موجود ہو وہ بدعت نہیں کہلائیں گی، مثلاً اصولِ فقہ، علمِ کلام، قرآنِ مجید پر اعراب لگانا وغیرہ کہ یہ اصولِ دین میں پہلے سے موجود تھے اور اعراب زبانوں پر پہلے سے جاری تھے۔ اہلِ علم نے اس کو مستقل فن بنا کر اس چھپی ہوئی چیز کو عام لوگوں کے لئے سہل الفہم بنا دیا۔ شریعت کے مشابہ طریقہ سے مراد یہ ہے کہ اصلاً شریعت میں اس کی کوئی اہمیت نہ ہو لیکن اس کے عمل سے ایسا محسوس ہوتا ہو کہ یہ بھی شریعت کا جزء ہے۔ مثلاً اپنی طرف سے ایسی قیود اور حدود کا قائم کرلینا جو کتاب اور سنت سے ثابت نہیں۔ مثلاً نذر مان لے کہ وہ اس طرح روزہ رکھے گا کہ بیٹھے گا نہیں۔ صرف کھڑا رہے گا، دھوپ میں رہے گا سایہ سے فائدہ نہ اٹھائے گا یا کسی خاص کیفیت وہیئت کو متعین کرلینا جس کو کتاب وسنت میں اہمیت نہ دی گئی ہو، مثلاً ہم آواز ہو کر اجتماعی ذکر کرنا یا کسی خاص عبادت کیلئے کسی خاص وقت کا مقرر کرنا وغیرہ، اس کی مزید وضاحت کے لئے شاطبی نے يقصد بالسلوك عليها المبالغة فى التعبد کا جملہ کہا ہے کہ ان افعال کے ذریعہ انسان کا مقصود عبادت اور ایک کارِ دین کو انجام دینا ہو، رہ گئیں وہ اختراعات وایجادات جن کا تعلق امورِ عادت سے ہے مثلاً ہاتھ دھونے کیلئے صابن کا استعمال وغیرہ تو یہ بدعت نہیں کہلائیں گی۔

---

[1] الاعتصام جلد ا صفحہ ۲۷۔

علامات

یہ تو بدعت کی اصولی تعریف ہے، لیکن بدعات کی شناخت کے لئے مختلف اصول اور علامتیں ہیں جن کی روشنی میں کسی چیز کے بدعت ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے کتبِ فقہ میں گو ایک جگہ مرتب طور پر ان کا ذکر نہیں ملتا تاہم مختلف جگہ فقہاء نے جن اعمال کے بدعت ہونے کا فیصلہ کیا ہے اور اس کی جو وجہ ذکر کی ہے، ان سے اس پر روشنی پڑتی ہے ذیل میں اختصار کے ساتھ ان کا ذکر کیا جاتا ہے:

جو عبادتیں انفرادی طور پر مشروع ہیں، ان کو اجتماعی طور پر انجام دینا اس کو بدعت بنا دیتا ہے مثلاً نفل نماز ایک انفرادی عمل ہے، نوافل میں تراویح اور بعض حضرات کے نزدیک تہجد میں جماعت کا اہتمام ثابت ہے۔ دوسری نوافل میں ایسا کرنا ثابت نہیں، لہذا نفل نمازوں میں جماعت درست نہ ہوگی۔

منعوا عن الاجتماع بصلوٰة الرغائب	فقہاء نے صلوٰة الرغائب کیلئے اجتماع سے منع
التی احدثها بعض المتعبدین لانها	کیا ہے جو بعض متصوفین کا من گھڑت طریقہ ہے
لم تؤثر علی هٰذه الکیفیة فی تلك اللیالی	اس لئے کہ ان مخصوص راتوں میں اس کیفیت کیساتھ
المخصوصة وان کانت الصلوٰة خیر	نماز پڑھنا ثابت نہیں ہے، گو نماز بجائے خود ایک
موضوع [1]	ایک بہترین عمل ہے۔

اسی طرح نفل نمازوں کے بعد دعا انفرادی عمل ہے۔ ان کو اجتماعی طور پر کیا جانے لگے تو یہ عمل بدعت قرار دیا جائے گا جیسا کہ آجکل بعض مقامات پر دعاء ثانیہ کا رواج سا ہوگیا ہے

[1] شامی ۲/۲۲۵۔

جو چیز سنت سے خفا رکے ساتھ ثابت ہو، خیر القرون میں لوگوں نے اس کو آہستگی سے کہا ہو، اس کو زور سے پڑھنا بدعت ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے تو کچھ لوگوں کو جو زور زور سے کلمہ طیبہ اور درود پڑھ رہے تھے، مسجد سے نکلوا دیا[۱]۔

کسی عمل کے لئے کوئی خاص وقت مقرر نہ ہو اور شریعت میں اس وقت کی اہمیت نہ بتائی گئی ہو۔ اب اگر اس خاص وقت میں اس عمل کو کیا جائے اور اہمیت دی جائے تو یہ بھی بدعت ہے۔ ابن رشد نے نقل کیا ہے کہ ان کے زمانے میں قرطبہ وغیرہ میں نمازِ صبح کے بعد لوگ مسجد میں قرأتِ قرآن کا التزام کیا کرتے تھے۔ حافظ ابن رشد نے اس کو بدعت قرار دیا، شاطبی کے الفاظ میں فرائ ذالك بدعة، ایک زمانہ میں لوگ یوم عرفہ کی شب میں مسجد میں جمع ہو کر اجتماعی طور پر دعا کرتے تھے تاکہ اہلِ عرفہ کی مشابہت ہو سکے، علماء نے اس کو بدعت قرار دیا[۲]۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یوم پیدائش کے موقع سے خصوصیت سے خوشیاں منانا یا اسے عید قرار دینا شاطبی کے نزدیک بدعت ہے[۳]۔

کسی عمل کے لئے حدیث میں کوئی خاص ہیئت اور کیفیت ثابت نہ ہو اور اس کا التزام کیا جائے، یہ بھی بدعت ہے مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام یقیناً مسنون، بعض حالات میں واجب ہے لیکن اس کے لئے قیام کا التزام جو قرونِ خیر میں ثابت نہیں، بدعت قرار پائے گا۔ امام مالکؒ کے زمانہ میں اسکندریہ کے لوگ ایک جگہ جمع ہو کر قرآن مجید کی کسی ایک سورت کی اجتماعی قرأت کیا کرتے تھے، امام مالکؒ تک اس کی اطلاع پہونچی تو انہوں نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ حضرت الامام کے مشہور شاگرد ابن قاسم کا بیان ہے کہ امام مالکؒ نے اس سے منع کیا اور اس کو بدعت قرار دیا نھی عنھا و راٰھا

---

[۱] بزازیہ ۳۷۹/۴۔

[۲] الاعتصام ۳۰/۲۔

[۳] الاعتصام ۲۹/۲۔

بدعۃ [1]۔

ایسا عمل جس سے دین کے کسی کام میں اضافہ یا کمی کا وہم پیدا ہو سکتا ہو یا نسبتہً کم اہم امر کے متعلق زیادہ اہمیت کا اظہار ہوتا ہو تو یہ بھی ممنوع ہے اور علماء نے اس کو بھی بدعت میں شمار کیا ہے تاکہ یہ عام لوگوں کے لئے غلط فہمی کا موجب نہ بن جائے۔

وبالجملة فكل عمل اصله ثابت شرعاً الا ان فى اظهار العمل به والمداومة عليه ما يخاف ان يعتقد انه سنة، فتركه مطلوب فى الجملة ايضاً من باب سد الذرائع [2]۔

حاصل یہ ہے کہ جس عمل کا ثبوتِ شرعی موجود ہو لیکن اس پر علی الاعلان عمل کرنے یا پابندی کرنے کی صورت میں اس بات کا اندیشہ ہو کہ اُسے سنت سمجھا جانے لگے گا تو بطور سدِّ ذرائع کے اس کو چھوڑ دیا جانا مطلوب ہے۔

چنانچہ اسی بناء پر امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ نے رمضان کے معاً بعد ستہ شوال کے روزے رکھنے سے منع فرمایا کہ کہیں لوگ اسے رمضان کا حصہ نہ سمجھ لیں۔ حضرت ابوبکر و عمر اور ابن مسعود قربانی کو واجب نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے خصوصیت سے بقرعید کے دن قربانی کرنے سے گریز کرتے تھے [3]۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ رمضان سے متصلاً پہلے ایک یا دو روزہ نہ رکھا جائے کہ بتدریج لوگ کہیں اسے رمضان المبارک کا جزء نہ سمجھ لیں۔

دین میں جو چیز واجب نہ ہو اس کا اس درجہ التزام کہ اگر نہ کیا جائے تو لوگ اسے مطعون کرنے لگیں اور اس کے ضروری ہونے کا وہم ہونے لگے، یہ بھی بدعت ہے مثلاً سورۂ اخلاص کی تلاوت اس کی اہمیت اور فضیلت اپنی جگہ تسلیم ہے لیکن اگر کوئی شخص ہمیشہ صرف سورۂ اخلاص ہی کی تلاوت کرے، یہ مکروہ ہوگا۔ مشہور فقیہ سفیان ثوری

---

[1] الاعتصام ۲/۲۔
[2] الاعتصام ۲/۳۲۔
[3] الاعتصام ۲/۳۲۔

نے اس کو مکروہ قرار دیا۔ امام مالکؒ کے زمانہ میں بعض لوگ ایک ہی رکعت میں سورۂ اخلاص کو بار بار پڑھتے تھے، امام صاحب سے جب اس کے بارے میں دریافت کیا گیا تو اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ یہ لوگوں کی من گھڑت بدعت ہے۔ ھٰذا من محدثات الامور التی احدثوا[1]۔

ہمارے زمانہ میں فرض نمازوں کے بعد دعا کے سلسلہ میں بعض مساجد میں بڑی شدت برتی جاتی ہے اور لوگ اسے جزو نماز تصور کر لیتے ہیں۔ اگر کہیں یہ صورت پیدا ہو جائے تو یہ عمل بدعت ہو جائے گا۔ اسی طرح عمامہ کا مسئلہ ہے اس میں شبہ نہیں کہ عمامہ آپؐ کی سنت ہے نہ صرف نماز میں بلکہ عام حالات میں بھی اس کا استعمال مسنون ہے لیکن اس بارے میں تشدد امام کے لئے عمامہ باندھنے کو لازم قرار دینا اور اس کو ائمہ کے نصب و عزل کی بنیاد بنا لینا ایک غیر واجب چیز کو واجب قرار دینے کے مرادف ہے اسی لئے ایسی شکل میں اس کا شمار بھی بدعت ہی میں ہوگا۔

جو عملِ خیر کسی خاص کام کے لئے ثابت نہ ہو وہاں اس کا اضافہ صریحاً بدعت ہے مثلاً اذان، یہ صرف نمازِ پنجگانہ کے لئے ہے، بعض اور موقعوں پر بھی اس کا ثبوت ہے لیکن نوافل کے لئے اذان ثابت نہیں، چنانچہ ہشام بن عبدالملک نے عیدین کے لئے اذان و اقامت کا سلسلہ جاری کیا تو علماء نے اس کو بدعت اور مکروہ قرار دیا[2]۔

ہمارے زمانہ میں دفن کے وقت اذان کا رواج اسی زمرہ میں ہے اور فقہاء نے اسے بدعت قرار دیا ہے۔ جانوروں کو ذبح کرتے وقت صرف کلمہ تکبیر ثابت ہے۔ اب اگر کوئی اس کے ساتھ حضور پر صلوٰۃ و سلام بھی بھیجے تو امام ابوحنیفہؒ نے اسے مکروہ اور امام احمدؒ نے بدعت کہا ہے[3]۔

---

[1] الاعتصام ۲/۳۲۔

[2] الاعتصام ۲/۱۸۔

[3] المیزان الکبریٰ، کتاب الاضحیہ جلد ۲۔

وہ اعمال جن میں غیر مسلموں سے تشبّہ کی بو آتی ہو وہ بھی بدعت ہے مثلاً شاطبی نے نقل کیا ہے کہ اہلِ سنت کا ایک گروہ نیروز اور مہرجان کے دنوں میں روزہ رکھا کرتا تھا اور جمع ہو کر عبادت کیا کرتا تھا، جو اسلام سے پہلے بعض قوموں کے تیوہار کے دن تھے۔ جب اس کے بارے میں طلحہ بن یزید الله غزاعی سے دریافت کیا گیا تو کہنے لگے بدعةٌ من اشد البدع ؎ ——— غیر مسلموں کے مختلف طبقات اپنے مخصوص لباس رکھا کرتے ہیں۔ بعض صوفیاء نے بھی اپنے لئے مخصوص وضع اور رنگ کے لباس رکھے ہیں جیسا کہ آج بھی بعض خانقاہوں میں سبز اور بعض میں زرد لباسوں کا رواج ہے، علماء نے اس کو بھی بدعت میں شمار کیا ہے ؎ اسی لئے بزرگانِ اہلِ سنت نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ یومِ عاشورہ کے موقع سے شہادتِ حسین کے ذکر کی مجلسیں منعقد ہوں اور فقہاء نے خصوصیت سے عصر اور فجر بعد کے مصافحہ کو منع کیا ہے کہ یہ روافض کا طریقہ ہے۔

حسنہ اور سیئہ کی تقسیم

بدعت کے باب میں ایک اہم مسئلہ بدعت کی حسنہ اور سیئہ یا واجب یا مستحب، مباح، مکروہ اور حرام کے درمیان تقسیم ہے۔ اس سے سلفِ صالحین کہ بہت سے سلفِ صالحین نے اس قسم کی تقسیم فرمائی ہے، وہ اپنی نیت کے اعتبار سے مخلص تھے، ان کا مقصد بدعات کے لئے چور دروازہ کھولنا نہیں تھا بلکہ بعض ان امور کو جن کی اصل قرونِ خیر میں موجود تھی اور وہ اپنی موجودہ شکل کے اعتبار سے نئی تھیں ——— ان

؎ الاعتصام ۲/۲۹۔

؎

بزرگوں نے لغت وتعبیر کے اعتبار سے "بدعت" کہدیا اور "بدعتِ شرعی" سے ان کو ممتاز کرنے کے لئے ان کو بدعتِ حسنہ" اور بدعتِ شرعی" کو "بدعتِ سیئہ" سے تعبیر کردیا، جن لوگوں کی نظر ان مثالوں پر ہو جو بدعتِ حسنہ کے سلسلہ میں کتابوں میں لکھی گئی ہیں وہ اس کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہ پائیں گے، مثلاً علم نحو وصرف، کتبِ فقہ کی تدوین وترتیب، تراویح کی جماعت، مدارس ومسافرخانوں کی تعمیر، خورد ونوش اور لباس ومکان میں لذت اندوز اشیاء کا اختراع اور راحت بخش سامان کی ایجاد واستعمال۔ ان میں سے بعض چیزیں تو وہ ہیں جن کا تعلق "عبادات" سے نہیں امورِ عادت سے ہے۔ اسی طرح اکثر امور ہیں جن کی اصل عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں موجود ہیں، نحو وصرف کے مدوّنہ قواعد اپنی اصل شکل میں قرآن وحدیث میں پہلے سے موجود ہیں پھر ان کا اصل تعلق "عربی زبان" سے ہے نہ کہ اسلام سے، فقہ اسلامی کی بابت استنباط واجتہاد کے احکام کتاب وسنت میں موجود ہیں، فقہ انہی کی مرتب شکل ہے، تراویح کی جماعت خود آپؐ سے ثابت ہے، مدارس اور مسافرخانوں کی تعمیر کے لئے صفہ کی نظیر موجود ہے جو عہدِ نبوی کا مدرسہ بھی تھا اور مہمان خانہ بھی، خورد ونوش اور لباس ومکان امورِ عادت میں ہے، پھر گاہے گاہے اچھا کھانا اور اچھے لباس پہننا خود آپؐ سے ثابت ہے۔ جن لوگوں نے ان کو "بدعتِ حسنہ" میں شمار کیا ہے، وہ ظاہر ہے محض لغت کے اعتبار سے "بدعت" ہے، شریعت میں بدعت کی جو تعریف کی گئی ہے یہ اس میں داخل ہی نہیں ہیں۔

بعد کے دور میں نفس پرست اور خوفِ خداوندی سے عاری مشائخ زُور نے اسی تقسیم کو اپنی ہر طرح کی بے راہ روی اور گمراہی کے لئے ڈھال بنایا اور ہر بدعت پر "بدعتِ حسنہ" کا غلاف چسپاں کردیا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد ہر بدعت سنت قرار پائی اور کوئی بدعت "بدعت" قرار نہیں رہی، محققین نے اس خطرہ کا احساس کیا اور پوری شدت سے اس تقسیم کی مخالفت فرمائی، امام ابواسحاق شاطبی لکھتے ہیں:

ان ھذا التقسیم امر مخترع لا یدل علیہ دلیل شرعی[1] حضرت مجدد الف ثانی فرماتے ہیں:

"دریں وقت عالم بواسطۂ کثرت ظہور بدعت در رنگ دریائے
ظلمت بنظر می درآید و نور سنت باغربت و ندرت دران دریائے
ظلماتی در رنگ کرمکہائے شب افروز محسوس می گردد"[2]

(تاریخ دعوت وعزیمت ج ۴ ص ۲۵۱)

ان بزرگوں نے جو بات کہی ہے اس پر حدیث ناطق ہے، آپ نے ارشاد فرمایا: کل محدثۃ بدعۃ وکل بدعۃ ضلالۃ، آپ نے کھلے لفظوں میں ہر ایجاد کردہ چیز کو بدعت قرار دیا جس کا تعلق دین سے ہو ارشاد ہے: من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ فھو رد[3] اور بدعت کو گمراہی اور قابلِ رد قرار دیا۔ اس میں حسنہ اور سیئہ کی تقسیم نہیں فرمائی۔ صحابہؓ (جو صحبتِ نبویؐ کی وجہ سے یقیناً دین کے فہم وادراک میں پوری امت پر فائق تھے) کے طرزِ عمل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، حضرت ابن مسعودؓ نے کچھ لوگوں کو مسجد میں نماز کے بعد زور زور سے بالجہر تکبیر پڑھتے ہوئے سنا تو سخت خفا ہوئے اور علامہ شامی وغیرہ کے بیان کے مطابق ان کو مسجد ہی سے نکال کر چھوڑا، اسی سے بعض فقہاء نے اجتماعی اور جہری ذکر کی کراہت پر استدلال کیا ہے۔ اب کوئی بتائے کہ اگر شریعت میں بدعت بھی حسنہ ہوتی تو ابن مسعودؓ اس ذکر کو بدعتِ حسنہ کی فہرست میں کیوں نہیں رکھتے؟ کتبِ حدیث میں موجود ہے کہ ایک شخص نے نمازِ عید سے پہلے عیدگاہ میں نفل پڑھنی چاہی تو حضرت علیؓ نے سختی سے منع فرمایا، حالانکہ نماز ایک "فعلِ حسن" ہی ہے نہ کہ فعلِ قبیح۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے اس

---

[1] الاعتصام ۱/۱۹۱۔

[2] مکتوب ۲/۲۳۔

[3] بخاری ۱/۳۷۱۔ مسلم ۲/۷۷۔

مؤذن کی تنبیہ ثابت ہے جو اذان کے بعد تثویب کرتا تھا، اب تثویب اپنی اصل کے اعتبار سے ظاہر ہے کہ نماز کی دعوت ہی ہے۔ اگر بدعتِ حسنہ کوئی چیز ہوتی تو ضرور تھا کہ ابن عمرؓ نے اس کو اسی زمرہ میں رکھا ہوتا۔ اس طرح کے بیسیوں واقعات صحابۂ کرام سے ثابت ہیں جو بدعت کی اس تقسیم اور بعض بدعات کے حسنہ ہونے کی کھلی تردید کرتے ہیں۔

کتبِ فقہ میں تو اس سلسلہ میں اس قدر نظیریں موجود ہیں کہ ان کو شمار کرانا مشکل ہے، اذان فی نفسہٖ کوئی بری چیز نہیں بلکہ شعائرِ اسلام میں ہے لیکن قبر پر اذان دینے کو فقہاء نے بدعتِ حسنہ کی فہرست میں نہیں رکھا بلکہ منع فرما دیا۔ مصافحہ سلام کی تکمیل اور اخلاق کا مظہر ہے لیکن فجر و عصر کے بعد کے مصافحہ کو فقہاء نے مکروہ طریقہ قرار دیا۔ معانقہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے محبت و تعلق کا اظہار ہے اور اس لحاظ سے کوئی برا کام نہیں مگر عید کے بعد ہمارے زمانہ میں معانقہ کا جو رواج ہے فقہاء اس سے منع کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو دعوت اور ان کو کھلانا عین اسلام ہے، ایک روایت میں آپؐ نے اطعامِ طعام (کھانا کھلانے) کو سب سے افضل عمل قرار دیا ہے، لیکن جس کے گھر میں موت ہوئی، اس کے اہلِ خانہ کی طرف سے سوم و چہلم کی دعوت کے بدعت اور مکروہ ہونے پر فقہاء متفق اللّسان ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اگر بدعتِ حسنہ اور سیئہ کی تقسیم درست ہوتی تو ان ساری بدعات کو "حسنہ" کی فہرست میں داخل ہونا چاہیے تھا اور فقہاء کو ان سے منع نہیں کرنا چاہیے تھا۔

اس لئے حقیقت یہ ہے کہ اس باب میں صحیح تصور وہی ہے جو علامہ شاطبی اور حضرت مجدد الف ثانیؒ نے پیش کیا ہے۔ اس کے بغیر کسی بدعت کو بدعت قرار دینا اور سنت اور بدعت کے درمیان خط امتیاز کھینچنا مشکل ہو جائے گا۔

بدعت
حدیثِ رسُول کی روشنی میں

حدیث میں کثرت سے بدعت اور اس کے مرتکبین کی مذمت کی گئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: جس نے دین کے معاملہ میں کسی نئی بات کا اضافہ کیا یا کوئی ایسا عمل کیا جو آپؐ کے حکم سے ثابت نہیں ہے وہ رد کئے جانے کے لائق ہے من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ فھو رد[1] ــــــــــ ایک خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: دنیا میں بدترین چیز وہ اضافے ہیں جو لوگ اپنی طرف سے کرلیں، ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی دوزخ میں لے جانے والی ہے، شر الامور محدثاتھا وکل محدثۃ بدعۃ وکل بدعۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار[2] ایک اور روایت میں ہے کہ بدعت سے پوری طرح بچ کر رہنا ایاکم و محدثات الامور[3] مدینہ کی خاص حرمت وعظمت کے پیش نظر فرمانِ نبوی ہے کہ جو شخص مدینہ میں کسی بدعت کو جنم دے یا بدعتی کو پناہ دے اس پر خدا کی، فرشتوں اور تمام انسانیت کی لعنت ہو نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کی کوئی نفل یا فرض عبادت قبول نہیں فرمائیں گے[4] جس شخص نے

دین میں کسی بدعت کو ایجاد کیا ہو اس کے متعلق وعید ہے کہ نہ صرف وہ اپنے عمل کا گنہگار ہوگا بلکہ جتنے لوگ اس کے مرتکب ہوں گے، ان سبھوں کی سزا میں کمی کئے بغیر ان سب کی سزا بھی اس شخص کیلئے ہوگی ۱ے۔ ایک دفعہ حضرت حسن کو نصیحت فرمائی کہ اگر تم پلک جھپکنے سے بھی کم وقت میں پل صراط سے گذر کر جنت تک رسائی چاہتے ہو تو اللہ کے دین میں اپنی طرف سے کوئی بدعت داخل نہ کرو فلا تحدث فی دین اللہ حدثاً برأیك ۲ے طحاوی نے نقل کیا ہے کہ چھ آدمیوں پر میری بھی لعنت ہے، اللہ کی اور خدا کے تمام مقبول انبیاء ورسل کی، پھر ان چھ آدمیوں میں پہلا نام یوں ذکر فرمایا، الزائد فی دین اللہ (اللہ کے دین میں اضافہ کرنے والا) بعض روایت میں ہے: میری سنت کے بجائے بدعت اختیار کرنے والا الراغب عن سنتی الی بدعة ۳ے پھر جب کبھی معاشرہ میں بدعات کا ظہور ہو تو علماء کی ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ وہ اس پر نکیر کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں، فرمانِ نبوی کے مطابق اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان پر خدا کی، فرشتوں کی اور تمام انسانیت کی لعنت ہوگی اذا احدث فی امتی البدع وشتم اصحابی فلیظهر العالم علمه فمن لم یفعل فعلیه لعنة الله والملٰئکة والناس اجمعین ۴ے۔ یہاں تک کہ ارشاد ہوا کہ بدعتی کی توقیر اور اس کا احترام بھی روا نہیں اور یہ اسلام کی بیخ کنی میں تعاون کرنے کے مرادف ہے من مشی الی صاحب بدعة لیوقرہ فقد اعان علی هدم الاسلام ۵ے۔ اور کیوں نہ ہو کہ بدعت کی ایجاد دراصل سنت کی عمارت کے انہدام اور اس سے انحراف ہے۔ اس لئے آپ نے فرمایا کہ جب کوئی قوم کسی بدعت کو ایجاد کرتی ہے تو اسی کے برابر سنت ان سے اٹھالی جاتی ہے ما احدث قوم بدعة الا رفع مثلها من السنة ۶ے۔

۱ے ترمذی۔ ۲ے الاعتصام ۱/۷۴۔
۳ے الاعتصام ۱/۷۵۔
۴ے کتاب السنة عن معاذ بن جبلؓ۔
۵ے
۶ے

بدعت اور سلف و صوفیائے کے اقوال

بدعت کی اسی شناعت اور عنداللہ اس بارے میں سخت پکڑ کی وجہ سے صحابہ کرام اور سلف صالحین کا رویہ اس بارے میں نہایت شدید رہا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا: ہمارے طریقوں کی پیروی کرو اور بدعت ایجاد نہ کرو علیکم بالعلم وایاکم والتبدع، آپ ہی سے نقل کیا گیا ہے کہ اعتدال کے ساتھ سنت پر عمل، بدعت میں مجاہدات سے بہتر ہے القصد فی السنۃ خیر من الاجتہاد فی البدعۃ [1] حضرت ابن عباسؓ نے اظہار افسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ سال بہ سال لوگ بدعت کو گھڑتے اور سنتوں کو ضائع کرتے چلے جائیں گے مایأتی علی الناس من عام الا احدثوا فیہ بدعۃ واماتوا سنۃ [2] ابوداؤد نے حضرت معاذ بن جبل سے نقل کیا ہے کہ بدعت سے خوب بچو اس لئے کہ جو بدعت بھی ایجاد کی جائے وہ گمراہی ہے فان ماابتدع ضلالۃ۔

بدعت کے بارے میں یہی شدت تابعین اور دوسرے بزرگوں کی رہی ہے صوفیاء کرام جن کو بعض حضرات بدعات کے معاملہ میں متساہل سمجھتے ہیں وہ بھی اس مسئلہ میں یہی رویہ رکھتے تھے، حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ بدعتی جس قدر مجاہدات اور نماز روزہ میں اضافہ کرتا ہے اسی قدر خدا سے دور ہوتا جاتا ہے الا ازداد من اللہ بعداً۔ ابو ادریس خولانی سے مروی ہے کہ مسجد کو جلتا ہوا دیکھوں اور بجھا نہ سکوں، یہ اس سے کمتر ہے کہ مسجد میں کوئی بدعت پاؤں اور اس کو بدل نہ سکوں، فضیل بن عیاض کہتے ہیں کہ گمراہی کے راستہ سے بچو اور زیادہ لوگوں کے اس راہ پر چل کر ہلاک ہونے کی وجہ سے دھوکہ نہ کھاؤ، حسن بصریؒ فرمایا کرتے تھے کہ بدعتی کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا نہ رکھو کہ یہ

---

[1]

[2]

دل کو بیمار کرتا ہے لاتجالس صاحب بدعۃ فانہ یمرض قلبك، ابو قلابہ سے نقل کیا گیا ہے کہ بدعتی مباح الدم ہو جاتا ہے استحل السیف یحیٰ بن ابی عمر شیبانی کہتے ہیں کہ بدعتی کو توبہ کی توفیق نہیں ہوتی، فضیل بن عیاض فرماتے ہیں: جو بدعتی کے ساتھ بیٹھا کرے وہ حکمت دین سے محروم رہے گا، لم یعط الحکمۃ۔

ابوبکر دقاق جو حضرت جنید بغدادی کے معاصرین میں ہیں کہتے ہیں کہ میرے دل میں گذرا کہ علم حقیقت، علم شریعت سے الگ ہے تو ندائے غیب آئی کہ جس حقیقت کے ساتھ شریعت نہ ہو وہ کفر ہے کل حقیقۃ لاتتبعھا الشریعۃ فھی کفر۔ شیخ جوزجانی سے دریافت کیا گیا کہ سنت کا کیا طریقہ ہے؟ فرمایا: بدعت کو ترک کرنا اور صدر اوّل کے علماء کی اتباع، ابو محمد بن عبدالوہاب ثقفی سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ درست اعمال ہی کو قبول کرتے ہیں، درست عمل وہ ہے جو خالص ہو اور عملِ خالص وہی ہے جو سنت کے مطابق ہو ومن خالصھا الاماوافق السنۃ۔ احمد بن ابی الحواری فرماتے ہیں: اتباعِ سنت کے بغیر جو عمل ہو وہ باطل ہے۔ شیخ حمدون قصار سے پوچھا گیا کہ لوگوں سے گفتگو کب کی جائے؟ فرمایا: جب کسی فرض کی ادائیگی میں کسی کی اعانت مقصود ہو تو کسی انسان کے بدعت میں پڑ کر ہلاک ہو جانے کا اندیشہ ہو، ابو القاسم نصرآبادی سے منقول ہے کہ تصوف کی روح کتاب وسنت کی پابندی اور بدعات وخواہشات سے گریز ہے[1]

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اپنے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں: صاحبو——! اسلام رو رہا ہے اور ان فاسقوں، بدعتیوں اور مکر کے کپڑے پہننے والوں اور ایسی باتوں کا دعویٰ کرنے والوں کے علم سے جو ان میں نہیں، اپنے سر کو تھامے ہوئے فریاد کر رہا ہے[2] امام اوزاعی سے نقل کیا گیا ہے کہ بدعتی سے گفتگو نہ کرو، نہ اس سے بحث کرو، وہ تمہارے دل

---

[1] یہ تمام اقوال الاعتصام ۱/ ۸۹ تا ۹۹ سے نقل کئے گئے ہیں۔

[2] فیوض یزدانی ص ۷۰۔

میں فتنہ کے بیج بودے گا۔[1]

حضرت شیخ احمد رومی فرماتے ہیں:

"اعتقادی بدعات کفر ہیں اور بعض کفر تو نہیں ہیں لیکن کبیرہ گناہوں سے بڑھ کر ہیں یہاں تک کہ قتل اور زنا سے بھی حتیٰ کہ اس سے اوپر بس کفر ہی کا درجہ ہے۔ رہی بدعت عبادت، سو اگرچہ یہ عبادتِ اعتقادی سے کمتر ہے لیکن اس پر عمل کرنا خصوصاً جب کہ سنّتِ مؤکدہ کے مخالف ہو، نافرمانی اور گمراہی ہے"[2]

شیخ احمد سرہندی امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کس قدر درد اور تڑپ اور بے قراری کے ساتھ فرماتے ہیں:

"حضرت حق تعالیٰ کی بارگاہ میں نہایت تضرع و زاری، التجا و نیازمندی اور تواضع و انکسار کے ساتھ خفیہ اور علانیہ درخواست کناں ہوں کہ دین میں جو کچھ بدعات اور نئی باتیں پیدا کرلی گئی ہیں جو عہدِ رسالت اور خلافتِ راشدہ میں نہ تھیں، گو وہ صبح کی سپیدی کی طرح روشن ہو۔ اس بندۂ ضعیف اور اس کی جماعت کو اس بدعت میں گرفتار نہ ہونے دے، رسول اللہؐ کے طفیل اس بدعت کے حسن کا مفتون ہونے سے بچائے"[3]

یہ تو عام بدعات و خرافات کا مسئلہ ہے، وہ بدعات جو اعتقاد سے تعلق رکھتی ہیں، ان کا معاملہ تو اور شدید ہے جو کفر و شرک تک جا پہونچی ہیں، جو لوگ خود کو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا عقیدتمند کہتے ہیں، کاش وہ حضرت شیخ کے

---

[1] الاعتصام۔

[2] ملاحظہ ہو: ترجمہ مجالس الابرار ص ۱۶۴۔

[3] دفتر اول، مکتوب ۱۸۶۔

اس ارشاد کو حرزِ جاں بنائیں :

"مخلوقات فنا محض اور عاجز ہیں، نہ ان کے ہاتھ میں ہلاکت ہے اور نہ کسی چیز کی ملکیت، نہ دولت ان کے اختیار میں ہے نہ محتاجی، نہ نفع ہے نہ نقصان، نہ ان کے پاس حکومت ہے سوائے اللہ تعالیٰ کے نہ اس کے سوا کوئی قادر ہے، نہ اس کے سوا کوئی دینے والا ہے نہ روکنے والا، نہ نافع نہ نقصان رساں، نہ زندگی دینے والا نہ موت سے دوچار کرنے والا۔[1]"

جو لوگ خود کو محبانِ اولیاء کہتے ہیں، ان کو چاہیے کہ حضرت شیخ کے اس ارشاد کو سرمۂ چشم اور مشعلِ راہ بنائیں۔

[1] الفتح الربانی مجلس ۶۱۔

بدعتی فقہاء کی نظر میں

بدعت اور بدعت کا ارتکاب کرنے والوں کے معاملہ میں شریعت نے جس شدت اور سختی کا معاملہ کیا ہے فقہاء نے بھی اس کو ملحوظ رکھ کر رائے قائم کی ہے۔ چنانچہ گو بدعتی شخص کے پیچھے بشرطیکہ اس کی بدعت کفر کی حد تک نہ پہونچے، نماز درست ہو جاتی ہے لیکن بہتر ہے کہ ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنے سے بچا جائے اور اسی وجہ سے غیر بدعتی امام کی اقتداء میں جتنا ثواب ہے، بدعتی امام کی اقتداء میں اس درجہ ثواب نہیں، فتاویٰ عالمگیری میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا گیا ہے:

تجوز الصلوٰۃ خلف صاحب هواء وبدعة وحاصله ان كان هو لا يكفر به صاحبه تجوز الصلوٰۃ خلفه مع الكراهة والا فلا۔ ولو صلى خلف مبتدع او فاسق فهو محرز ثواب الجماعة لكن لا ينال مثل ماينال خلف تقي۔[1]

ہوا پرست اور بدعتی کے پیچھے نماز جائز ہے بشرطیکہ بدعت کفر تک نہ پہونچے اور یہ نماز بھی کراہت کے ساتھ جائز ہوگی اور اگر بدعت کفر تک پہنچ گئی تو اقتداء جائز نہ ہوگی۔ اگر بدعتی یا فاسق کے پیچھے نماز پڑھے تو جماعت کا ثواب حاصل ہو جائے گا لیکن اس درجہ نہیں جو متبعِ سنت امام کی اقتداء میں حاصل ہوتا ہے۔

بدعتی یا تو کافر ہوگا یا فاسق اور فاسق کا حکم یہ ہے کہ اگر اس کے اصلاح کی

---

[1] جلد ا صفحہ ۸۴۔

توقع نہ ہو تو اس کی برائی کی حوصلہ شکنی کرنے کے لئے اس کے مقابلہ سلام میں پہل نہیں کرنی چاہئے۔

فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے:

لایسلم علی الشیخ المازح او الوند	سلام نہ کرے مسخرے، شرابی، جھوٹے، لغوگو،
او الکذاب او اللاعن ومن یسب	لوگوں کو گالی دینے والے اور بازار میں عورتوں
الناس وینظر الیٰ وجوہ النسوان فی	کی طرف نظر بازی کرنے والوں کو جن کا تائب
الاسواق ولاتعرف توبتہ [1]	ہونا معلوم نہ ہو۔

چوں کہ بدعت ان امور سے بڑھ کر فسق و فجور میں داخل ہے، اس کا تقاضہ ہے کہ بدعتی کو اگر توہین بدعت کی نیت سے سلام میں پہل نہ کی جائے تو مضائقہ نہیں۔

بدعتی ـــــــ محدثین کی نظر میں!

محدثین کی رائے ہے کہ بدعتی کی حدیث نہیں قبول کی جائے گی اس لئے کہ کلامِ رسول کے بارے میں اس کی راست گوئی یقینی نہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس مسئلہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ بدعت اگر کفر کے درجہ تک پہونچی ہوئی ہو تب تو اس کی روایت بالکل قابلِ قبول نہیں اور اگر صرف فسق کا موجب ہو تو دو شرطوں کے ساتھ روایت قبول کی جائے گی۔ اوّل یہ کہ وہ لوگوں کو بدعت کی طرف دعوت نہ دیتا ہو، دوم یہ کہ وہ جو حدیث پیش کر رہا ہو وہ اس کی کسی مبتدعانہ فکر کی تائید میں نہ ہو۔

ثم البدعۃ اما بمکفر او بمفسق ٭ پھر بدعت یا تو قابلِ تکفیر ہوگی یا قابلِ تفسیق،

---

[1] عالمگیری ۴/ ۹۶۔

الاول لایقبل صاحبہا الجمہور، والثانی یقبل من لم یکن داعیۃ فی الاصح الا ان روی مایقوی بدعتہ فیرد علی المختار وبہ صرح الجوزجانی شیخ النسائی [1]

پہلی شکل میں جمہور اس کی روایت کو قبول نہیں کرتے ہیں، دوسرے شخص کی روایت قبول کی جاتی ہے بشرطیکہ وہ اپنے عقائد کی طرف داعی نہ ہو اور نہ اس کی اس روایت سے بدعت کو تقویت پہنچتی ہو۔

علمِ غیب

علمِ غیب یعنی ماضی و مستقبل کی تمام باتوں سے باخبر ہونا صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ قرآن مجید نے متعدد مقامات پر اس کی صراحت فرمادی ہے:

عندہ مفاتیح الغیب لایعلمہا الا ھو۔ (انعام: ۵۹)

ولو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر۔ (اعراف: ۱۸۸)

فقل انما الغیب للہ فانتظروا انی معکم من المنتظرین۔ (یونس: ۲۰)

ولا اقول لکم عندی خزائن اللہ ولا اعلم الغیب۔ (ہود: ۳۱)

قل لایعلم من فی السمٰوٰت و الارض الغیب الا اللہ۔ (نمل: ۶۵)

---

[1] نزہۃ النظر شرح نخبۃ الفکر مطبوعہ بیروت ص: ۵۰، ۵۱۔

اس لئے فقہاء نے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو "عالم الغیب" ماننے کو کفر قرار دیا ہے۔ ملا علی قاری شرح فقہ اکبر میں لکھتے ہیں:

ذکر الحنفیۃ تصریحاً بالتکفیر باعتقاد ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعلم الغیب لمعارضۃ قولہ تعالیٰ قل لا یعلم من فی السمٰوات والارض الغیب الا اللہ۔[1]

فقہائے احناف نے صراحۃً لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں علمِ غیب کا عقیدہ کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد قل لا یعلم الخ کے خلاف ہونے کی وجہ سے۔

فتاویٰ بزازیہ میں ہے:

تزوج بلا شھود وقال "رسول خدائے دراو فرشتگان را گواہ کردم" یکفر لانہ اعتقد ان الرسول والملک یعلمان الغیب بخلاف قولہ "فرشتگان عر دست راست وچپ را گواہ کردم" لانہما یعلمان۔[2]

کسی نے بغیر گواہ کے نکاح کیا اور کہا کہ "خدا کے رسول اور فرشتوں کو میں نے گواہ بنایا" تو اس کی تکفیر کی جائے گی اس لئے کہ اس نے یہ اعتقاد رکھا کہ رسول اور فرشتے غیب جانتے ہیں۔ برخلاف اس کے کہ وہ کہے میں نے دائیں اور بائیں کے فرشتے کو گواہ بنایا اس لئے کہ وہ غیب جانتے ہیں۔

اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (نعوذ باللہ) عالم الغیب قرار دینا کفر اور اللہ تعالیٰ کی صفات خاص میں غیر اللہ کو شریک ٹھہرانا ہے۔

حاضر و ناظر

اسی طرح ہر جگہ اور ہر وقت موجود ہونا جس کو "حاضر و ناظر" ہونے سے تعبیر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہی کی صفت خاص ہے۔ اس لئے کہ اس کی ذات ہر طرح کی تحدید

---

[1] شرح فقہ اکبر ص: ۲۲۵۔ [2] بزازیہ علیٰ ہامش الہندیہ ۳۲۵/۶۔

اور جہت سے ماوراء ہے۔ اس کے سوا جتنی مخلوقات ہیں وہ محدود ہیں اور وہ ہر جگہ حاضر و ناظر نہیں، اس سے خدا کے رسول اور نبی بھی مستثنیٰ نہیں۔ خود آپؐ کی سیرت مبارکہ میں بیسیوں واقعات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بعض حالات و واقعات سے واقف نہ ہوسکے، ظاہر ہے اگر آپ ہر وقت اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہوتے اور اس بارے میں آپؐ کی وہی شان ہوتی جو جناب باری تعالیٰ کی ہے تو آپ کو کسی واقعہ سے بے خبر نہیں ہونا چاہیئے۔

چنانچہ جیسا کہ مذکور ہوا فقہاء نے لکھا ہے کہ کسی شخص نے نکاح کے موقع سے اللہ اور رسول کو گواہ بنایا تو نکاح بھی منعقد نہ ہوگا اور ایسے شخص کو کافر بھی قرار دیا جائے گا۔

تزوج امراۃ بشہادۃ اللہ ورسولہ لاینعقد وھل یکفر عرف فی الفاظ الکفر۔[1]	اللہ اور اس کے رسول کو گواہ بنا کر کسی عورت سے نکاح کیا تو نکاح منعقد نہیں ہوگا، اور کیا ایسے شخص کو کافر قرار دیا جائیگا تو اس جملہ کو الفاظِ کفر ہی میں شمار کیا گیا ہے۔

یہ اسی لئے کہ عاقد نے اللہ تعالیٰ کی طرح آپ کو بھی مجلس نکاح میں حاضر اور واقعۂ نکاح کا ناظر تصور کیا۔ جب یہ حکم رسول اللہ کو حاضر و ناظر یقین کرنے کی صورت میں ہے تو ظاہر ہے دوسرے اولیاء اور بزرگوں کے بارے میں اس قسم کا عقیدہ بدرجۂ اولیٰ "کفر" کا باعث ہوگا۔ چنانچہ فقہ و فتاویٰ کی مشہور کتاب "براز یہ" میں ہے:

من قال ارواح المشائخ حاضرۃ یکفر۔[2]	جس نے کہا کہ مشائخ کی روحیں حاضر و ناظر ہیں اس کو کافر قرار دیا جائے گا۔

---

[1] خلاصۃ الفتاویٰ ۱۵/۲، عالمگیری ۲۸۳/۲۔

[2] براز یہ علیٰ ہامش الہندیہ ۳۲۵/۴۔

تصرفِ اولیاء اور — یا عبدالقادر شیئاً للہ

اولیاء کرام اور اللہ کے بندگانِ صالحین کے متعلق یہ عقیدہ کہ وہ دنیا میں تصرفات کرتے ہیں اور لوگوں کے نفع وضرر کا باعث بن سکتے ہیں جو اصل میں بزرگوں سے متعلق غلو آمیز عقائد اور مبالغہ آمیز عقیدہ وسلوک اور ان سے سوال و استمداد کی بنیاد ہے، بجائے خود غیر درست ہے اور اس کا عقیدہ رکھنا کفر ہے۔ مشہور فقیہ علامہ ابن نجیم مصری لکھتے ہیں :

ومنها ان ظن ان المیت	اور انہیں موجباتِ کفر میں سے یہ ہے کہ میت
یتصرف فی الامور دون اللہ تعالیٰ	کے بارے میں یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا
واعتقادہ ذلك كفر [1]	وہ بھی امور میں تصرف کرتے ہیں اور ایسا عقیدہ رکھنا کفر ہے۔

اور ایسے شخص کو کافر اس لئے قرار دیا جائے گا کہ یہ خدا کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض ایسے اوصاف اور اختیارات میں شریک ٹھہرانا اور خدا کا ہمسر بنا دینا ہے جو اسلام کے تصورِ توحید کے مطابق صرف باری تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے۔ اب غور فرمائیے کہ "یا عبدالقادر شیئاً للہ" ایک طرف غیر اللہ سے استعانت واستمداد کو بتاتا ہے اور دوسری طرف اس عقیدے کو بھی کہ حضرت شیخ علیہ الرحمۃ حاضر وناظر، ہر جگہ موجود اور کائنات میں متصرف اور مختار ہیں۔ یہ دونوں ہی باتیں اسلام کے تصورِ توحید سے یکسر متعارض اور متصادم ہیں،

---

[1] البحر الرائق / ۲۹۸ قبیل باب الاعتکاف۔

اس لئے کوئی شبہ نہیں کہ یہ اور اس طرح کے دوسرے فقرے نہایت نامناسب اور کفریہ ہیں اور ستم ظریفی ہے کہ ان کلمات کے ذریعہ خود حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمۃ کے احترام و تعظیم کا تصور ہے جو توحید کے زبردست داعی، اتباعِ سنت کے حامی، بدعت اور احداث فی الدین کے مخالف اور ایسے تصورات اور رسوم کے سخت ناقد تھے اور جن کی کتاب "فتوح الغیب" عقیدہ کی تطہیر اور توحید کی طرف دعوت کی نہایت مؤثر اور طاقتور تحریر ہے۔

"بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است"

قبر سے استمداد و استعانت

اسلام کا تصور ہے کہ صرف خدا ہی ہے جو اس لائق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور صرف اسی کی ذات والا صفات کو سزاوار ہے کہ اس کے سامنے تمام انسانیت اپنا دست استعانت دراز کرے، سورۂ فاتحہ میں اسی مضمون کو "ایاک نعبد وایاک نستعین" سے تعبیر کیا گیا ہے اور پھر اہلِ ایمان کے ذہن میں اس تصور و عقیدہ کو راسخ کرنے اور اس کو تازہ رکھنے کی غرض سے ہر نماز اور ہر نماز کی ہر رکعت میں اس کو قرأت کا حکم دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے جس دین نے ہمیں توحید خداوندی کا اتنا محکم تصور دیا ہے وہ کس طرح اس بات کو گوارہ کرسکتا ہے کہ انسان قبروں کے سامنے اپنی ضرورت کی کشکول لے کر کھڑا ہو اور خدا کے بجائے ان سے مانگے اور سوال کرے؟ فقہاء نے دین و شریعت کے اس مزاج و مذاق کو سامنے رکھتے ہوئے اہل قبر سے استمداد اور سوال و استعانت سے منع کیا ہے، چنانچہ مشہور محدث علامہ محمد طاہر پٹنی قبر پر ہونے والی مختلف قسم کی بدعات اور غیر شرعی رسوم پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

فان منهم من قصد بزيارة قبور الانبياء والصلحاء ان يصلى عند قبورهم ويدعو عندها ويسألهم الحوائج وهذا لايجوز عند احد من علماء الصالحين فان العبادة وطلب الحوائج والاستعانة منه وحده [1]

انبیاء وصلحاء کی قبروں کی زیارت سے بعض لوگوں کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ قبروں کے پاس نماز ادا کی جائے، دعا کی جائے اور حاجات وضروریات مانگی جائیں، علماء وصلحاء میں سے کسی کے نزدیک یہ جائز نہیں اس لئے کہ عبادت، ضروریات کی طلب اور مدد چاہنا صرف اللہ ہی سے ہے۔

خود مجالسِ ابرار میں ہے:

ومنها اى من الامور المخالفة (للدين) العكوف عندها وتعليق الستور عليها واتخاذ السدنة والطواف بها.

مخالف دین امور میں سے قبر کے پاس لگا رہنا اس پر چادر چڑھانا، اس کے لئے خدام رکھنا اور اس کا طواف کرنا بھی ہے۔

وتقبيلها واستلامها ودعاء اصحابها وسوالهم النصر والرزق والولد وغير ذلك من الحاجات.

مخالفِ دین امور میں سے قبروں کو چومنا، اس کا بوسہ لینا، اصحاب قبر سے نصرت، رزق، اولاد وغیرہ حاجتوں کا مانگنا بھی ہے۔

آگے ان کاموں اور اس طرح کی دوسری باتوں کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

ليس شئ منها مشروعاً باتفاق ائمة المسلمين [2]

ان میں سے کوئی بات امت کے ائمہ کے نزدیک بالاتفاق جائز نہیں ہے۔

اور اس کی وجہ ظاہر ہے اس لئے کہ اللہ کے علاوہ اولیاء صالحین یا انبیاء طاہرین یا امت کا کوئی طبقہ اس بات کا مجاز ہی نہیں کہ وہ کائنات میں تصرف اور انسانی ضرورتوں کی تکمیل کرے۔

---

[1] مجمع بحار الانوار ۲/۷۲۔

[2] مجالس ابرار ص ۱۲۸، ۱۲۹۔

ومنہا ان ظن ان المیت یتصرف فی الامور دون اللہ تعالیٰ و اعتقادہٗ ذٰلک کفر[1]

اور انہیں امورِ کفر میں سے یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ میت تصرف کرتا ہے اور ایسا عقیدہ رکھنا کفر ہے۔

پھر ان سے مانگنے کا کیا فائدہ؟ اور ان سے استعانت کیوں کر جائز اور درست ہو۔؟

مشائخ کے نام پر جانوروں کو چھوڑنا

جانوروں کو پیروں اور مشائخ کے نام پر چھوڑنا کہ ان کا تقرب حاصل کیا جائے جائز نہیں بلکہ کفر ہے، حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی نے تفسیر نیشاپوری سے نقل کیا ہے:

قال العلماء ولو ان مسلماً ذبح ذبیحۃ وقصد بذبحھا التقرب الیٰ غیر اللہ صار مرتداً وذبیحتہ ذبیحۃ مرتد[2]۔

علماء نے کہا ہے کہ کوئی مسلمان کسی ذبیحہ کو ذبح کرے اس سے اس کا مقصد غیر اللہ کا تقرب حاصل کرنا ہو تو وہ مرتد ہو جائے گا اور اس کا ذبیحہ مرتد کا ذبیحہ ہوگا۔

علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں:

ذبح لقدوم الامیر ونحوہ کواحد من العظماء یحرم لانہٗ اھل بہ لغیر اللہ ولو ذکر اسم اللہ ولو ذبح للضیف لایحرم لانہ سنۃ الخلیل واکرام الضیف اکرام اللہ تعالیٰ

امیر یا کسی اہم شخص کے آنے پر جو جانور ذبح کیا جائے وہ حرام ہے اس لئے کہ وہ غیر اللہ کے نام پر کیا گیا ہے اور اگر اللہ کا نام لیا جائے اور مہمان کے لئے ذبح کر دیا جائے تو حرام نہیں ہوگا اس لئے کہ یہ سنتِ ابراہیمی ہے اور مہمان

---

[1] البحر الرائق ۲/ قبیل باب الاعتکاف۔
[2] مجموعۃ الفتاویٰ۔

والفارق بينهما ان قدمها ليأكل منها كان الذبح لله والمنفعة للضيف او للوليمة وان لم يقدمها ليأكل منها بل يدفعها لغيره كان لتعظيم غير الله فتحرم وهل يكفر قولان [1]۔

کا اکرام اللہ تعالیٰ کا اکرام ہے اور ان دونوں کے درمیان تمیز اس طرح ہوگی کہ اگر اس کا گوشت مہمان کے سامنے کھانے کیلئے رکھا گیا تو یہ ذبح اللہ کے لئے سمجھا جائے گا اور منفعت مہمان کیلئے یا ولیمہ کے لئے اور اگر کھانے کے لئے مہمان کے سامنے پیش نہیں کیا بلکہ دوسروں کو دیدے تو یہ جانور غیر اللہ کی تعظیم میں ذبح کیا گیا لہذا یہ جانور حرام ہوگا اور ذابح کافر ہوگا یا نہیں؟ اس میں دو قول ہے۔

ہمارے زمانہ میں جو لوگ پیروں، بزرگوں کے نام پر جانور چھوڑتے ہیں، ان کا مقصود صرف بزرگوں کی تعظیم ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ انسان خود اپنی طرف سے قربانی کے لئے یا اپنے والدین کے ایصالِ ثواب کیلئے بطور قربانی جو جانور رکھتا ہے اس کی اپنے والدین کے نام سے نسبت نہیں کرتا، اس کے برخلاف بزرگوں کے نام پر قربان ہونے والا جانور انہیں سے منسوب ہوتا ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ "مثلاً یہ غوث پاک کا بکرا ہے"۔ اس لئے اس کے ناجائز قرار دیئے جانے ہی میں احتیاط ہے اور اگر ہم ایسا کرنے والوں کو حسنِ ظن سے کام لیتے ہوئے کافر نہ کہیں تب بھی اس کے قریب بہ کفر ہوتے میں کوئی شبہ نہیں۔

نذر و نیاز

نذر عبادت ہے اور تمام عبادات صرف اللہ تعالیٰ ہی

---

[1] درمختار ۱۹۶/۵، قبیل کتاب الاضحیۃ۔

کے لئے ہیں، اس لئے غیر اللہ سے کسی طرح کی نذر ماننا جائز نہیں، اس حکم میں بزرگوں کے نام پر نذر ماننا بھی ہے۔ چنانچہ علامہ عبد الرشید طاہر بخاری لکھتے ہیں:

النذر بغیر اللہ تعالیٰ حرام لانہ من انواع الکفر لان ھذا عبادۃ والعبادۃ لغیر اللہ تعالیٰ کفر لہ	غیر اللہ کی نذر ماننا حرام ہے اس لئے کہ یہ کفر کی ایک قسم ہے کیوں کہ یہ عبادت ہے اور غیر اللہ کی عبادت کفر ہے

⁘ ⁘ ⁘

بزرگوں کی قبروں پر چراغ جلانے، روپیہ ڈالنے وغیرہ کی نذر ماننا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ حصکفی لکھتے ہیں:

اعلم ان النذر الذی یقع للاموات من اکثر العوام وما یوخذ من الدراھم والشمع والزیت ونحوھا الی ضوائح الاولیاء الکرام تقربا الیھم فھو بالاجماع باطل وحرام ما لم یقصد واصرفھا الفقراء الانام ؎	جان رکھ کہ وہ نذر جو مُردوں کیلئے اکثر عوام کی طرف سے کی جاتی ہے اور اولیاء کرام کی قبروں پر روپے، چراغ تیل وغیرہ ان کے تقرب کیلئے چڑھائے جاتے ہیں وہ بالاجماع باطل اور حرام ہے سوائے اس کے کہ فقراء پر اس کا صرف کرنا مقصود ہو۔

یارسول اللہ اور نعرۂ رسالت وغوث

مسلمانوں کی مشرکانہ بدعات میں سے ایک وہ ہے جس کو "نعرۂ رسالت" یا رسول اللہ اور "نعرۂ غوث" "یا غوث" کے عنوان سے وضع کر لیا گیا ہے، عہدِ رسالت اور قرونِ خیر میں "نعرۂ تکبیر" کے سوا کسی نعرہ کا ذکر نہیں ملتا، یہ ایک صریح بدعت ہے۔ فقہی اور شرعی اعتبار سے اس مسئلہ کی حیثیت جاننے کے لئے "یارسول اللہ" وغیرہ کا محل استعمال دیکھنا ہوگا اور اس بات پر غور کرنا ہوگا کہ اس تعبیر کے پیچھے کیا عقیدہ اور کیا فکر کارفرما ہے؟

لہ خلاصہ ۳۷۸/۲ ۔

؎ درمختار ۔

اگر یا رسول اللہ بطور اظہار عشق اور قرب روحانی کے کہا جائے جیسے کہ شاعر اپنے محبوب کو صیغہ خطاب سے مخاطب کرتا ہے حالانکہ وہ سامنے موجود نہیں ہوتا، تو اس میں مضائقہ نہیں لیکن اگر ندا اور پکار کے بطور کہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ کو "یا اللہ" کہہ کر مخاطب کرتا ہے تو یہ جائز نہیں۔ اس لئے کہ یہ دو عقیدوں کو شامل ہے۔ ایک یہ کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استمداد کو درست سمجھتا ہے اور آپ کو کائنات میں "متصرف" باور کرتا ہے اور دوسرے وہ آپ کو حاضر و ناظر جانتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ آپ ہر جگہ موجود ہیں، اس لئے کہ ندا موجود ہی کے لئے ہوتی ہے غائب کے لئے نہیں اور یہ دونوں ہی عقیدے وہ ہیں جو اسلام کے عقیدۂ توحید کے منافی ہیں۔ استمداد و استعانت کے سلسلہ میں ابن نجیم مصری کا قول گذر چکا ہے:

ان ظن ان المیت یتصرف فی الامور	یہ گمان کرنا کہ معاملات میں خدا کے علاوہ میت بھی
دون اللہ تعالیٰ واعتقادہ ذلک کفر۔	تصرف کرتا ہے اور اس کا اعتقاد رکھنا کفر ہے۔

اور غیر اللہ کے حاضر و موجود ہونے کا عقیدہ رکھنے کے سلسلہ میں فتاویٰ کی مشہور کتاب "بزازیہ" کا فیصلہ بھی مذکور ہو چکا ہے کہ من قال ارواح المشائخ حاضرۃ یعلمون یکفر۔ ——— آجکل اکثر مقتدایانِ قوم افسوس کہ ببانگِ دہل ان مشرکانہ تصورات کے ساتھ "یا رسول اللہ" اور یا غوث کہنے کو درست جانتے ہیں بلکہ اس کی بھرپور وکالت کرتے ہیں۔ اس لئے فی زمانہ اس طرح کے کلمات قطعاً ناجائز ہیں اور کوئی شبہ نہیں کہ ان نعروں سے شرک کی بو آتی ہے (اعاذنا اللہ منہ) ——— یہی وجہ ہے کہ علماء نے "یا رسول اللہ" وغیرہ کا ورد کرنے سے منع کیا ہے۔ جناب مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانوی نے مولانا ثناء اللہ صاحب پانی پتی خلیفہ حضرت مظہر مرزا جانجاناں سے کیا خوب نقل کیا ہے:-

"چنانچہ کسے بطور وظیفہ یا محمد یا محمد گفتہ باشد روا نباشد"
کوئی شخص بطور وظیفہ "یا محمد" "یا محمد" پڑھے تو جائز نہ ہوگا۔

اور حضرت موصوف ہی کی "ارشاد الطالبین" میں مذکورہ عبارت "الجنۃ لاھل السنۃ" کے حوالہ سے اس طرح نقل کرتے ہیں:

لایصح الذکر باسماء الاولیاء علیٰ سبیل الوظیفۃ اولسیفی لقضاء الحاجۃ کما یقرء الجہال۔[۱]

اور بطور وظیفہ اولیاء کے ناموں کا ذکر یا وظیفہ "سیفیہ" پڑھنا ضروریات کی تکمیل کیلئے جیسا کہ جہلاء پڑھتے ہیں جائز نہ ہوگا۔

قبروں کو سجدہ اور طواف

سجدہ عبادت ہے اور عبادت صرف اللہ ہی کے لئے ہے۔ اس لئے غیر اللہ کو۔ خواہ وہ ولی یا پیر ہو یا کسی نبی اور بزرگ کی قبر ہو، سجدہ کرنا حرام اور ناجائز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو اس بات سے منع فرمادیا تھا کہ وہ آپ کو سجدہ کریں، پہلی امتوں میں غیر اللہ کو تعظیمی سجدہ کرنا جائز تھا، ایسے سجدہ کی ممانعت تھی جس میں عبادت مقصود ہو لیکن سجدۂ تعظیم اور سجدۂ عبودیت میں امتیاز برقرار رکھنا مشکل تھا اور یہی تعظیم بہ تدریج اس کو معبودیت کے مقام پر پہونچادیتی تھی۔ اس لئے شریعتِ محمدی میں شرک کی طرف جانے والے اس دروازہ کو ہی بند کردیا گیا اور ہر طرح کے سجدہ کی ممانعت کردی گئی۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ فرماتے ہیں:

"سجدہ کردن بسوئے قبور اولیاء وطواف گرد قبور کردن ودعا از آنہا خواستن ونذر برائے آنہا قبول کردن حرام است بلکہ

۱۔ بحوالہ ارشاد الطالبین ص: ۱۹۔
۲۔ اختلاف امت اور صراط مستقیم ۱/۵۰۔

پچیز ہا ازاں بکفر رساندہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بر آنہا لعنت گفتہ
وازاں منع فرمودند وگفتہ کہ قبر مرا بت نہ کنند[1]"

(ترجمہ) "اولیاء کرام کی قبروں کی طرف رخ کر کے سجدہ کرنا۔ ان کے پھیرے لگانا، ان سے دعا کرنا اور ان کے لئے نذریں قبول کرنا حرام ہے بلکہ ان میں سے بہت سی باتیں کفر تک پہونچا دیتی ہیں۔ آپؐ نے ان پر لعنت فرمائی ہے اور ان سے منع کیا ہے کہ میری قبر کو بُت نہ بنالینا"

طواف وسجدہ کجا، عالمگیری کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کی قبر کو ازراہِ محبت چومنا یا اس پر ہاتھ رکھنا درست ہے جیسے کہ والدین کی قبر لیکن ازراہِ برکت و تعظیم قبر پر ہاتھ رکھنا اور چھونا بھی کراہت سے خالی نہیں اور بعض اہلِ علم نے اس کو بدعت قرار دیا ہے۔

لانعرف وضع الید علی المقابر سنۃ ولا مستحسنا ولا نری بہ بأسا وقال شمس الائمۃ بدعۃ کذا فی القنیۃ ولا یمسح القبر ولا یقبلہ فان ذلک من عادۃ النصاریٰ ولا بأس بتقبیل قبر والدیہ[2]۔	قبروں پر ہاتھ رکھنے کو نہ ہم سنت سمجھتے ہیں اور نہ مستحب اور نہ اس میں کوئی مضائقہ سمجھتے ہیں مگر شمس الائمہ نے کہا یہ بدعت ہے اور ایسا ہی قنیہ میں ہے نہ قبر کو چھوئے نہ چومے کہ یہ نصاریٰ کی عادت ہے، ہاں والدین کی قبر کا بوسہ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ابن نجیم مصری نے ایک مقام پر کعبہ کے علاوہ کسی مسجد کے طواف کو منع کیا ہے اور ایسا کرنے پر کفر کا اندیشہ ظاہر کیا ہے ولو طاف حول مسجد سوی الکعبۃ یخش علیہ الکفر[3] جب کسی اور مسجد کے طواف کو صحیح نہیں سمجھا گیا جو یقیناً اللہ کے

---

[1] مالا بدمنہ

[2] کتاب الکراہیۃ جلد ۴ ص: ۱۱۰۔

[3] البحر الرائق

گھر ہیں اور جناب رسالت مآب کی زبان حق ترجمان میں روئے ارض کا سب سے بہترین خطہ (خیر بقاع الارض) ہیں تو آخر قبروں کے پھیرے کس طرح جائز قرار دیئے جاسکیں گے؟ اور اس کے عمل بدعت ہونے میں کیا شبہ؟

میلاد، عیدِ میلاد اور قیام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے واقعات وحالات بیان کرنا ایک ایسی بات ہے جو یقیناً مطلوب ہے۔ اس لئے کہ اسلام کی نگاہ میں ہدایت و فلاح اور نجات درستگاری تمام تر آپؐ کی اور آپؐ کے ایک ایک نقشِ پا کی پیروی اور متابعت میں ہے اور یہ اس وقت ممکن ہے جب کہ آپؐ کی حیاتِ طیبہ مسلمانوں کی نگاہ میں ہو اس لئے ایسے جلسوں کا انعقاد جس میں سیرتِ نبوی کا ذکر ہو، بے شک جائز بلکہ بہتر ہے۔

لیکن افسوس کہ ہمارے زمانہ میں اس کے ساتھ متعدد ایسی چیزیں شریک کردی گئی ہیں جس نے اس کی حقیقی افادیت کو بھی ضائع کر دیا ہے اور بدعات کے زمرہ میں لاکھڑا کیا ہے۔

ان میں پہلی چیز خاص تاریخوں، مثلاً ۱۲ ربیع الاول کی تعیین ہے۔ ظاہر ہے یہ تعیین شریعت سے ثابت نہیں بلکہ اس میں اہلِ کفر سے تشبّہ ہے، دنیا کی اکثر قومیں اپنے پیشواؤں کے یومِ پیدائش کو تہوار کی حیثیت سے مناتی ہیں، عیسائیوں کا یومِ پیدائش تو دنیا بھر میں مشہور ہے اور اس سے بڑا ظلم یہ ہے کہ اس کو عید میلاد کا نام دیا جائے۔ عید ایک شرعی اور دینی اصطلاح ہے اس لئے

ظاہر ہے کہ اس کا استعمال انہیں مواقع کے لئے ہوگا جن کا عید ہونا کتاب و سنت سے ثابت ہو، اسی لئے امام ابو اسحاق شاطبی نے بدعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

کالذکر بھیئة الاجتماع علی صوت واحد	جیسے کہ ہم آواز ہو کر اجتماعی طور پر ذکر کرنا اور آپ
واتخاذ یوم ولادة النبی صلی اللہ علیہ وسلم عیداً۔ ¹	کے یوم پیدائش کو عید کے طور پر منانا۔

علامہ تاج الدین فاکہانی کا مسلک اور ان کا قول معروف ہے کہ:

لا جائز ان یکون عمل المولد مباحاً لان	ممکن نہیں ہے کہ عمل میلاد درست اور مباح ہو۔
الابتداع فی الدین لیس مباحا	اس لئے کہ دین میں کسی نئی بات کا اضافہ بالاجماع
باجماع المسلمین ²	مباح نہیں ہے۔

ابن امیر الحاج فرماتے ہیں:

ومن جملة ما احدثوہ من البدع مع	اور من جملہ من گھڑت بدعات کے ایک جس کو وہ بہت
اعتقادھم ان ذلک من اکبر العبادات	بڑی عبادت اور شعائر اسلام کا اظہار تصور کرتے ہیں
واظہار الشعائر ما یفعلونہ فی شہر	وہ ہے جو ربیع الاول کے مہینہ میں میلاد کے سلسلہ میں
ربیع الاول من المولد وقد احتوی ذلک	کیا کرتے ہیں اور یہ میلاد مختلف بدعات اور حرام
علی بدع ومحرمات ³	چیزوں کو شامل ہے۔

دوسری بدترین خرابی ان مجلسوں میں مبالغہ آمیز واقعات اور موضوع و بے اصل روایات کا بیان ہے۔ اکثر تو ان پیشہ ور مقررین کے نزدیک رسول کا مقام خدا سے بھی آگے بڑھا دیا جاتا ہے (نعوذ باللہ) جو ظاہر ہے اللہ کے غضب کو بھڑکانے والی بدترین بات ہے۔

تیسرے ان مجالس میں صلوٰة وسلام کے ساتھ قیام بھی کرتے ہیں اور اس

---

¹ الاعتصام ۳۹/۱۔

² مجموعة الفتاویٰ

³ المدخل ص ۵، ۷۔

کے پیچھے یہ عقیدہ کارفرما ہوتا ہے کہ جب صلوٰۃ وسلام پڑھا جاتا ہے تو مجلس میں آپ بنفسِ نفیس تشریف لاتے ہیں، یہ آپؐ کے حاضر و ناظر ہونے کا عقیدہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ کفر کا اور سرمایۂ ایمان لٹ جانے کا باعث ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ صرف تعظیماً کھڑے ہو جاتے ہیں، یہ بات کئی وجوہ سے غلط ہے، اولاً اگر تعظیم مقصود ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے رسول سے زیادہ قابلِ تعظیم ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ اسمِ باری تعالیٰ پر بھی کھڑا ہوا جائے۔ دوسرے اگر آپؐ کے نام مبارک ہی کی تعظیم مقصود ہے تو پھر جب جب اسمِ گرامی آئے کھڑا ہونا چاہیے نہ کہ ایک خاص موقع پر، تیسرے تعظیم کا یہ وہ طریقہ ہے جس سے وہ آپؐ نے منع فرمایا ہے، صحابہ ایک بار آپؐ کے احترام میں کھڑے ہو گئے، آپؐ نے ناپسند فرمایا اور ارشاد ہوا: لاتقوموا کما الاعاجم[1]۔

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آپؐ کے نکلنے پر ہم لوگ کھڑے نہ ہوتے تھے اور یہ اس لئے کہ ہم لوگ جانتے تھے کہ آپؐ اس کو ناپسند فرماتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جب حیاتِ طیبہ میں آپؐ نے اپنے وجود باوجود کے ساتھ تشریف لانے پر احتراماً کھڑے ہونے کو ناپسند فرمایا تو وفات کے بعد صرف آپؐ کے اسمِ گرامی آنے پر قیام کیونکر آپؐ کی نگاہ میں پسندیدہ اور درست عمل ہو سکتا ہے؟

یہ اور ان کے علاوہ مختلف خرافات ہیں جن کی وجہ سے اب اس کے ناجائز اور بدعت ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور اس لئے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا فقہا نے صراحۃً اس طرح کی میلاد کو منع فرمایا ہے۔

---

[1]

کلمۂ شہادت پر ابہام کا بوسہ

ایک بدعت اذان و اقامت کے درمیان "اشہد ان محمداً رسول اللہ" (صلی اللہ علیہ وسلم) پر انگلیاں آنکھوں پر پھیرنے اور ان کو چومنے کی رائج ہے۔ یہ بھی ایک بے اصل بدعت ہے، اگر آپ کے اسمِ پاک کی تقدیس مقصود ہے تو پھر جب بھی آپ کا نام لیا جائے یہی عمل کرنا چاہیے اور آپ کے نام سے زیادہ "باری تعالیٰ" کا نام اس بات کا مستحق ہے کہ اس پر یہ عمل کیا جائے اور اس کی تعظیم و تکریم کا اظہار ہو، کیونکہ وہ تمام مخلوقات سے بڑھ کر تعظیم و تکریم کا حقدار ہے۔

اس سلسلہ میں حضرت ابوبکرؓ کا جو معمول نقل کیا جاتا ہے وہ بالکل موضوع من گھڑت اور بے اصل ہے۔ علامہ طاہر پٹنی نے اس روایت کو موضوع قرار دیا ہے[1] زرقانی کا بیان ہے:

مسح العینین بباطن اعلی السبابتین بعد تقبیلھما عند قول المؤذن اشھد ان محمداً رسول اللہ لا یصح[2]	شہادت کی انگلیوں کے بالائی حصہ کا بوسہ لے کر مؤذن کے "اشہد ان محمداً رسول اللہ" کہنے کے وقت آنکھوں پر پھیرنا درست نہیں ہے۔

یہی رائے سخاوی، ابن ربیع، غرس الدین خلیلی جیسے بلند پایہ ناقدین کی ہے[3] ——— اس حدیث کے ضعف کیلئے یہ بات ہی کافی ہے کہ اذان اور اس میں کلمۂ شہادت ایک ایسی چیز ہے جو بار بار سامنے آتی ہے اور پوری امت اس سے وابستہ ہے اس کے باوجود صحابہ کی اتنی کثیر تعداد میں یہ

---

[1] تذکرۃ الموضوعات، ص ۳۴۱۔

[2] مختصر المقاصد الحسنہ، ص ۱۸۲۔

[3] ملاحظہ ہو سخاوی کی "المقاصد الحسنہ ص ۳۸۲"، ابن ربیع کی "تمیز الطیب ۱۵۱" اور غرس الدین کی "کشف الالتباس ۱/۳۰۶"۔

صرف حضرت ابوبکرؓ سے مروی ہے اور وہ بھی ایسے راویوں کے ذریعہ جو اپنی نااعتباری میں اس درجہ آگے ہیں کہ محدثین انکی روایات کو موضوع قرار دیتے ہیں۔

کھانے پر فاتحہ

کھانے پر جو مروجہ فاتحہ دی جاتی ہے اس کی کوئی اصل نہیں اور صریح بدعت ہے۔ شریعت نے اصول متعین کر دیا ہے کہ جو ذبیحے ہوں ان پر ذبح کے وقت "بسم اللہ اللہ اکبر" کہا جائے اور دوسرے کھانے پر مسنون ہے کہ کھانے سے پہلے "بسم اللہ وعلیٰ برکۃ اللہ" اور کھانے کی تکمیل پر کلمۂ حمد "الحمد للہ الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا من المسلمین" کہا جائے۔ اس کے علاوہ کوئی ذکر نہیں جو آپؐ سے منقول ہو، فقہ کی کتابوں میں کھانے کے آداب سے متعلق جو تفصیل ہے اسے ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

وسنن الطعام البسملة فی اوله والحمد لله فی آخره فان نسی البسملة فی اوله فلیقل اذا ذکر بسم الله علیٰ اوله وآخره[1]	کھانے کی سنت شروع میں بسم اللہ اور آخر میں الحمد للہ کہنا ہے، اگر شروع میں بسم کہنا بھول جائے تو جب یاد آئے کہے: بسم اللہ علیٰ اولہ وآخرہ۔

یہی تفصیل دوسری کتب فقہ میں بھی ہے۔ آپ سوچئے کہ اس مروجہ فاتحہ کا کہیں کوئی ذکر ہے؟ اور اس کی کوئی اصل ہے؟ ایصالِ ثواب کے لئے کھانا ہو تو اس پر بھی فاتحہ کی ضرورت نہیں، کہ وہ صدقہ کے حکم میں ہے اور صدقات کی جتنی صورتیں شریعت میں ہیں یعنی زکوٰۃ و صدقۃ الفطر وغیرہ جس کا مقصود صدقہ کرنے والے کا اپنے آپ کو ثواب پہونچانا ہوتا ہے ان میں کہیں یہ حکم نہیں کہ سامنے رکھ کر کچھ مخصوص آیات پڑھ کر فاتحہ دی جائے تب ہی زکوٰۃ و صدقہ قبول ہوگا ورنہ نہیں

---

[1] عالمگیری ۴/۱۰۳۔

یا کم از کم ازراہِ استحباب ہی اس پر فاتحہ دینے کا حکم ہو، یہی وجہ ہے کہ ان چیزوں پر کوئی فاتحہ نہیں دیتا۔

شب برأت میں چراغاں

شبِ برأت، شبِ قدر کے موقع سے دوکانوں، بازاروں، گھروں اور مسجدوں میں چراغاں کرنا اور قمقمے لگانا بھی جائز نہیں بلکہ گناہ ہے۔

ان اسراج السرج الكثيرة ليلة البرأة في السكك والاسواق بدعة وكذا في المساجد ويضمن القيم بل لو ذكره الواقف وشرطه لا يعتبر ذلك الشرط شرعا وان لم يكن من مال الوقف بل تبرع به يكون ذلك تبذيرا واضاعة المال والتبذير حرام بنص القرآن [1]

شب برأت میں گلیوں اور بازاروں میں چراغاں کرنا بدعت ہے اور یہی حکم مسجدوں میں چراغاں کرنے کا ہے اور مسجد کے نگراں اور متولی ایسا کرنے پر ضامن ہوں گے اگر وقف اور چندہ کے مال سے چراغاں کرے بلکہ اگر وقف کنندہ نے ایسا کرنے کا ذکر بھی کیا ہو اور شرط لگائی ہو تو شرعاً ایسی شرط کا بھی اعتبار نہ ہوگا اور اگر یہ خرچ وقف کے مال میں سے نہ کیا بلکہ اپنی طرف سے تبرعاً کیا ہو تب بھی یہ فضول خرچی ہے اور فضول خرچی قرآن مجید کی صراحت کے مطابق حرام ہے۔

اسی طرح ان راتوں میں خصوصیت کے ساتھ نماز کے لئے جمع ہونا یا جمع کرنا اور اس کی دعوت دینا حدیث سے ثابت نہیں ہے اور جن نمازوں کے لئے ایسا اہتمام ثابت نہ ہو، ان میں اس طرح کا اہتمام جائز نہیں اور یہ ایک طرح کی بدعت ہے، اس لئے فقہاء نے "نماز رغائب" اور اس کے لئے جمع ہونے کو منع کیا ہے کہ یہ حدیث سے ثابت نہیں ہے۔

---

[1] ردالمحتار ۲:۲۳۵۔

عرس و قوالی

کسی بزرگ کے قبر کی زیارت کے لئے کوئی خاص دن متعین کر لینا اور اس پر جمع ہونا ـــــــــــــــ جس کو عوام کی زبان میں عرس کہا جاتا ہے، بدعت ہے۔

لا یجوز ما یفعله الجهال بقبور الاولیاء والشهداء من السجود والطواف حولها واتخاذ السروج الیها ومن اجتماع بعد الحول کالاعیاد ویسمونه عرساً۔

جہلاء، اولیاء و شہداء کی قبروں کے ساتھ سجدہ اسکے گرد طواف، چراغ جلانے اور ایک سال کے بعد عید کی طرح جمع ہونا (جس کو عرس کہتے ہیں) وغیرہ جو عمل کرتے ہیں، یہ جائز نہیں ہے۔

پھر اس موقع سے مشائخ کا خاص قسم کے کپڑے پہننا قوالی و سماع اور اپنے آپ پر حال کی کیفیت طاری کرنا یہ سبھی بدعت ہیں۔

سئل الحلوانی عمن سموا انفسهم بالصوفیة فاختصوا بنوع لبسة واشتغلوا باللهو والرقص وادعوا لانفسهم منزلة فقال افتروا علی الله کذبا وسئل انهم ان کانوا زائغین علی الطریق المستقیم هل ینفون من البلاد لقطع فتنتهم عن العامة فقال، اماطة الاذی ابلغ فی الصیانة

امام حلوانی سے ان لوگوں کے بارے میں دریافت کیا گیا جو خود کو صوفیاء کہتے ہیں، مخصوص قسم کا لباس پہنتے ہیں، لہو اور رقص میں مشغول ہیں اور اپنے لئے خاص مقام و مرتبہ کا ادعاء کرتے ہیں، حلوانی نے جواب دیا، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ پر جھوٹ گھڑا ہے۔ دریافت کیا گیا پھر کیا ان گم گشتہ راہ لوگوں کو فتنہ کے سدباب کے لئے شہروں سے جلا وطن کر دیا جائے؟ فرمایا: گندگی کو ہٹا دینا حفاظت کے

لے

وامثل فی الدیانة وتمییز الخبیث من الطیب ازکیٰ واولیٰ کذا فی التاتارخانیة قال السماع والقول بالرقص الذی یفعله المتصوفة فی زماننا حرام لایجوز القصد الیه و الجلوس علیه وهو والغناء والمزامیر سواءٌ ؎

لئے زیادہ بہتر طریق اور دینی اعتبار سے زیادہ صحیح راہ ہے، نیز خبیث کو طیب سے چھانٹ دینا زیادہ مفید اور بہتر ہے۔ نیز فرمایا سماع اور صوفیاً کے طریقہ پر رقص و وجد ہمارے زمانہ میں حرام ہے اس میں شرکت کرنا اور بیٹھنا حرام ہے یہ سماع اور گانا بجانا برابر ہے۔

وسیلہ کا مسئلہ

توسل سے مراد کسی کا واسطہ دے کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا ہے، توسل کی بعض صورتیں بالاتفاق جائز ہیں اور بعض ناجائز ہیں اور بعض کے جائز اور ناجائز ہونے میں اختلاف ہے۔

(۱) جس توسل پر اتفاق ہے وہ ہے اعمالِ صالحہ کا توسل، آپ اخلاص کے ساتھ کوئی عمل کریں پھر دعا کریں اور خدا کے حضور اپنے اس عمل کو بطور وسیلہ پیش کریں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل کے تین اشخاص کا ذکر فرمایا جن پر اتفاق سے پہاڑ کی چٹان آگرنے سے غار کا راستہ بند ہوگیا تھا، ان تینوں حضرات نے اپنے بعض نیک اعمال کا واسطہ دیکر اللہ تعالیٰ سے راہ کھل جانے کے لئے گریہ وزاری کی اور حق تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی ؎

(۲) دوسری شکل اللہ کے ان نیک اور برگزیدہ بندوں کے واسطہ کی ہے

؎ فتاویٰ عالمگیری ۴/۱۱۰۔

؎

جو ابھی زندہ ہوں، اس صورت کو بھی اکثر اہلِ علم نے جائز قرار دیا ہے، احادیث میں اس کی نظیریں موجود ہیں ——— حضرت عمرؓ کے زمانہ میں قحط پڑا تو حضرت عمرؓ نے دعا فرمائی۔

اللّٰھم کنا نتوسل الیك نبینا — بارِ الٰہی! ہم اپنے نبیؐ کو آپ کے پاس وسیلہ

وانا نتوسل الیك بعم نبینا — بناتے تھے، اب ہم نبیؐ کے چچا کو وسیلہ بناتے ہیں

فاسقنا [1] — کہ ہم کو سیراب سے سیراب کرے۔

اسی طرح آپؐ فقراء مہاجرین کا واسطہ دیکر مسلمانوں کی فتح کے لئے دعا فرمایا کرتے تھے کان یستفتح بصعالیك المہاجرین [2] یہ ظاہر ہے کہ زندوں کا توسل ہے۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ اللہ کے ان صالح بندوں کا واسطہ دیا جائے، جن کی وفات ہو چکی ہے. خصوصیت سے آپؐ کا وسیلہ بغیر اس کے کہ آپؐ کو کائنات میں متصرف اور نفع و نقصان میں مؤثر سمجھا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ حدیث سے صریح طریق پر اس کا ثبوت نہیں، تاہم بعض مطلق حدیثیں ہیں جو اس کے جواز کو بتاتی ہیں اس سلسلہ میں حضرت عثمان بن احنف کی حدیث قابلِ ذکر ہے، فرماتے ہیں:

ان رجلا ضریر البصر اتی — ایک نابینا شخص آپؐ کی خدمت میں آیا اور عرض

النبی فقال ادع اللہ لی ان یعافینی — کیا کہ میرے لئے اللہ تعالیٰ سے عافیت کی دُعا

فقال ان شئت صبرت وان شئت — فرمایئے، آپؐ نے فرمایا کہ اگر چاہو تو اس دُعا کو

دعوت فقال ادعہ فامرہ ان یتوضأ — مؤخر کردو اور چاہو تو دُعا کردوں، انھوں نے

فیحسن وضوءہ ویصلی رکعتین — دعا کرنے کی خواہش کی، آپؐ نے حکم دیا اچھی طرح

---

[1] بخاری عن انس

[2] مشکوٰۃ ... ۴۴۴.

ویدعو بهذا الدعاء : اللّٰهمّ انی اسئلك واتوجه الیك بمحمد نبی الرحمة یا محمد انی توجهت بك الی ربی فی حاجتی هٰذه لیقضی اللّٰهمّ فشفعه فیّ[1]۔

وضو کرلیں اور دو رکعت نماز ادا کریں پھر اس طرح دعا کریں کہ اے اللہ! میں آپ سے مانگتا ہوں اور نبی رحمت محمدؐ کے واسطہ سے آپ کی طرف توجہ کرتا ہوں، اے محمدؐ! آپکے وسیلہ سے میں اپنے پروردگار کی طرف اپنی اس ضرورت کیلئے متوجہ ہوں تو خدایا، آپ کی سفارش قبول فرما۔

٭ ٭ ٭

اس حدیث کو امام ترمذی نے صحیح قرار دیا ہے۔ نیز مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے لکھا ہے کہ خود سرخیل جماعت اہلِ حدیث علامہ شوکانی نے "تحفۃ الذاکرین" میں اس حدیث کی صحت سے اتفاق کیا ہے۔

اس حدیث میں آپؐ نے کوئی قید نہیں لگائی ہے کہ یہ دعا صرف میرے حین حیات ہی درست ہے، اس سے اس نوعیت کے توسل کے جواز کا اشارہ ملتا ہے۔ تاہم طبرانی نے نقل کیا ہے کہ حضرت عثمان غنی کے عہد میں ایک شخص جو آپکے پاس آمدورفت رکھتا تھا، کسی ضرورت سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، حضرت عثمان رضؓ نے کسی وجہ سے اس کی طرف توجہ نہیں کی، حضرت عثمان بن حنیف نے اس طریق پر دعا کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ اب جو وہ دوبارہ آیا تو حضرت عثمان غنی رضؓ نے اس کی طرف پوری ہمدردی کے ساتھ توجہ فرمائی، پھر جب اس شخص نے حضرت عثمان بن حُنیف کا شکریہ ادا کیا کہ شاید آپنے امیر المؤمنین سے میرے بارے میں گفتگو کی ہے تو حضرت عثمان بن حُنیف نے انکار کر دیا، فرمایا کہ اصل میں یہ اسی دُعا کا اثر ہے[2]۔ اس روایت کی روشنی میں "اثر صحابہ" سے توسل ثابت

---

[1] ابن ماجہ، نسائی، ترمذی عن عثمان بن حُنیف، باب الدعوات۔

[2] التعلیق الصبیح، کتاب الاذکار۔

[3] [illegible] ۹۹۔

ہے، تاہم اس کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ اس روایت کی صحت اور استناد مشتبہ ہے، اسلئے کہ اس میں روح بن صلاح نامی راوی آئے ہیں جن کو گو ابن حبان اور حاکم جیسے بلند پایہ محدثین نے ثقہ قرار دیا ہے لیکن بعض حضرات نے ان کو ضعیف بھی قرار دیا ہے[1]۔ تاہم قرآن مجید میں انبیاء کرام اور احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رض کی جو دعائیں منقول ہیں، ان میں اس طرح کا توسل نہیں ملتا، اسلئے دعاء میں توسل کو مستحب نہیں کہا جا سکتا، نیز موجودہ زمانہ میں ضعیف الاعتقادی کو دیکھتے ہوئے گمان ہوتا ہے کہ عین ممکن ہے کہ اس سے عوام گمراہی میں مبتلا ہو جائیں اور غیر اللہ کے لئے قدرت و تصرف اور اختیار کے عقیدہ میں مبتلا ہو جائیں، اس لئے فی زمانہ اس سے احتیاط ہی بہتر معلوم ہوتا ہے۔

④ چوتھی صورت یہ ہے کہ جن کا وسیلہ دیا جا رہا ہے، ان کو بھی کارخانۂ قدرت میں متصرف سمجھا جائے، یا یوں گمان کیا جائے کہ وہ خدا کے ارادہ و فیصلہ پر اثر انداز ہو جائیں گے، ظاہر ہے یہ صورت کفر ہے، کیوں کہ پہلے گذر چکا ہے کہ مشائخ اور بزرگوں کی ارواح کو متصرف جاننا فقہاء کے نزدیک از قبیلِ کفر قرار پایا ہے۔

⑤ پانچویں صورت یہ ہے کہ وسیلہ میں بزرگوں کے حق، جاہ و حرمت کا حوالہ دیا جائے، مثلاً بحقِ فلاں، بجاہِ فلاں، بحرمتِ فلاں، یہ صورت بھی جائز نہیں، اس لئے کہ اہلِ سنت کے مسلک کے مطابق خدا پر کسی کا کوئی حق نہیں، نہ خدا کی ذات کے سامنے کسی کے جاہ و حرمت کی کوئی اہمیت ہے۔

درمختار میں ہے:

وکرہ قولہ بحق رسلك وانبیائك واولیائك او بحق البیت لانہ لاحق للخلق علی الخالق[2]	بحق رسول، بحق نبی، بحق ولی یا بحق بیت اللہ وغیرہ کہنا مکروہ ہے، اسلئے کہ مخلوق کا خالق پر کوئی حق نہیں۔

نیز علامہ مرغینانی فرماتے ہیں:

ویکرہ ان یقول فی دعائہ بحق فلان وبحق اولیائك لانہ لاحق للخلوق علی الخالق[3]۔	دعاء میں بحقِ فلاں یا بحقِ ولی وغیرہ کہنا مکروہ ہے کہ خالق کا مخلوق پر کوئی حق نہیں۔

---

[1] انجاح الحاجۃ حاشیہ ابن ماجہ ص ۹۹

[2] درمختار علی ہامش رد المحتار ۵/۲۵۴۔

[3] الہدایہ ۴/۴۵۹، کتاب الکراہیۃ۔

مروّجہ سلام وقیام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام بھیجنا ہر امتی پر آپ کا حق ہے، کسی صاحبِ ایمان کے لئے اس سے انکار کی گنجائش نہیں اور جب کبھی آپ کا نام آئے بعض اہلِ علم کے نزدیک ہر بار صلوٰۃ وسلام کے کلمات کہنا واجب ہے اور بعض حضرات کا خیال ہے کہ مجلس میں اگر متعدد بار آپ کا ذکر مسعود آئے تو بہتر تو ہر دفعہ صلوٰۃ وسلام کہنا ہے تاہم اگر ایک ہی دفعہ کہنے پر اکتفا کرے تو بھی کافی ہے۔

ومن سمع اسم النبی مرارا لایجب علیه الصلوٰۃ فی کل مرۃ لان الصلوٰۃ علیه فرض فی الجملة عند کل سماع وفی بعض شروح الجامع الصغیر یجب علیه عند کل سماع ^۱	جو حضورؐ کا نام بار بار سنے اس پر ہر دفعہ صلوٰۃ وسلام واجب نہیں، اس لئے کہ اس پر صلوٰۃ وسلام فی الجملہ واجب ہے اور "جامع صغیر" کی بعض شروح میں ہے کہ ہر دفعہ صلوٰۃ وسلام کہنا واجب ہے۔

تاہم دو اصول یاد رکھنے چاہئیں' اوّل یہ کہ کتاب و سنت میں جس عبادت کے لئے کوئی کیفیت اور ہیئت متعین نہیں، اس کے لئے کسی خاص کیفیت کی تعیین' دوسرے جس کام کے لئے کسی خاص وقت کو اہمیت نہ دی گئی ہو اس کے لئے اس وقت کا تقرر، یہ دونوں ہی چیزیں سنّت کو بھی بدعات بنا دیتی ہیں، امام ابواسحاق شاطبی لکھتے ہیں:

ومنها التزام الکیفیات والهیئات المعینة کالذکر بهیئة الاجتماع علی صوت	اور بدعات میں سے مخصوص کیفیات اور ہیئتوں کا التزام ہے، جیسے ہم آواز ہو کر اجتماعی ذکر یا مخصوص

---

^۱ خلاصۃ الفتاویٰ ۴/۳۳۱۔

واحب ومنها التزام العبادات المعينة في اوقات متعينة لم يوجد لها ذلك التعيين في الشريعة [1]۔	اوقات میں مخصوص عبادات کا التزام حالانکہ اس قسم کی تعیین شریعت میں نہ پائی جائے۔

٭ ٭ ٭ ٭

جمعہ یا کسی خاص نماز کے بعد خصوصیت سے صلوٰۃ وسلام نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے نہ حضرات صحابۂ کرام سے، نہ کتب فقہ میں اس کا ذکر ہے بلکہ اس کے لئے اس وقت کی تعیین بالکل بے معنی ہے، فقہاء نے نماز جنازہ کے بعد دفین سے پہلے دوبارہ دعاء کو بدعت قرار دیا ہے کہ نماز جنازہ میں دعاء ہو چکی ہے یہی حال نماز کا ہے۔ نماز میں قعدۂ اخیرہ میں اور نماز جمعہ میں خود خطبہ میں صلوٰۃ و سلام موجود ہے پھر نماز کے بعد علٰحدہ صلوٰۃ وسلام کا التزام کوئی معنی نہیں رکھتا۔

اور اس کے لئے قیام تو بالکل ہی بے اصل چیز ہے، اگر درود وسلام میں قیام کی اہمیت ہوتی تو نماز میں درود بحالتِ قیام مشروع ہوتا نہ کہ بحالتِ قعدہ، خود خیر القرون میں کہیں یہ ثابت نہیں کہ آپ پر صلوٰۃ وسلام کے لئے خصوصیت سے قیام کیا گیا ہو۔

تیسرے صلوٰۃ وسلام اجتماعی صورت میں ہوتا ہے، جو اعمال خیر القرون میں اجتماعی طور پر ثابت نہ ہوں، ان کو اجتماعی ہیئت کے ساتھ انجام دینا بدعت ہے، فتاویٰ کی کتابوں میں اس کی متعدد نظیریں موجود ہیں، از راہِ اختصار یہاں ایک دو کا ذکر کیا جاتا ہے:

قراءة الكافرون الى الآخر مع الجمع مكروهة لانها بدعة لم ينقل عن الصحابة وعن التابعين [2]	مجمع کے ساتھ سورۂ کافرون سے آخر تک پڑھنا مکروہ ہے اس لئے کہ یہ بدعت ہے، صحابہ اور تابعین سے منقول نہیں۔

---

[1] الاعتصام ۱/۳۹۔ [2] عالمگیری ۴/۹۱۔

یکرہ الدعاء عند ختم القرآن بجماعۃ لان ھذا لم ینقل عن النبی صلعم [1]

ختم قرآن مجید کے وقت اجتماعی دُعا مکروہ ہے کیوں کہ ایسا کرنا آپؐ سے منقول نہیں ہے۔

پس ـــــ کسی خاص نماز کے بعد "صلوٰۃ و سلام" وہ بھی کھڑے ہو کر اور اجتماعی صورت میں بدعت ہے۔

اجتماعی ذکر و فاتحہ

مروجہ بدعات و خرافات میں ایک نمازوں کے بعد اجتماعی ذکر ہے، جس میں تسبیح و استغفار وغیرہ کے کلمات کہے جاتے ہیں، جیسا کہ ابھی ذکر کیا جا چکا ہے، یہ بھی بدعت ہے۔ نہ یہ وقت کا لزوم صحیح ہے نہ اس کو اجتماعی طور پر ادا کرنا درست ہے اور نہ اس کو جہر کے ساتھ با آواز بلند کہنا جائز ہے۔ اذکار و اوراد کو آہستہ پڑھنا چاہیے۔

ولو اجتمعوا فی ذکر اللہ تعالیٰ والتسبیح والتہلیل یخفون [2]

اگر اللہ تعالیٰ کے ذکر اور تسبیح و تہلیل کیلئے اکٹھے ہوں تو آہستہ پڑھیں۔

فتاویٰ بزازیہ میں نقل کیا گیا ہے:

رفع الصوت بالذکر حرام وقد صح عن ابن مسعود انہ سمع قوماً اجتمعوا فی مسجد یہللون ویصلون علیہ الصلوٰۃ والسلام جہراً فراح علیہم فقال عہدنا ذٰلک علی عہدہ علیہ السلام ولا اراکم الا مبتدعین

ذکر میں آواز بلند کرنا حرام ہے، حضرت ابن مسعودؓ سے ثابت ہے کہ انہوں نے کچھ لوگوں کو جمع ہو کر کلمہ طیبہ اور صلوٰۃ و سلام پڑھتے دیکھا تو ان کے پاس گئے اور فرمایا: ہم نے حضور کا زمانہ دیکھا ہے اور میرا خیال تمہارے متعلق نہیں ہے مگر یہ کہ تم بدعت گڑھنے والے ہو، حضرت ابن مسعودؓ اس

---

[1] عالمگیری ۹۲/۴۔

[2] عالمگیری ۹۰/۴۔

فمازال یذکر ذلک حتی اخرجہم عن المسجد ؎۱

بات کو دُہراتے رہے یہاں تک کہ ان کو مسجد سے نکال دیا۔

یہی حال فاتحہ کا ہے جس کا کتاب و سنت میں کوئی ثبوت نہیں۔

قراءۃ الفاتحۃ بعد المکتوبۃ لاجل المہمات مخافتۃ اوجہرا مع الجمع مکروھۃ ؎۲

فرائض کے بعد اہم ضروریات کیلئے آہستہ یا زور سے فاتحہ پڑھنا اجتماعی طور پر مکروہ ہے۔

❖ ❖ ❖ ❖

دعاءِ ثانیہ

فرض نمازوں کے بعد ایک دفعہ دعا کرنا آپؐ سے ثابت ہے، البتہ آپؐ کے معمولات کو سامنے رکھ کر فقہاء نے لکھا ہے کہ جن فرض نمازوں کے بعد سُنن ہیں ان میں دُعا مختصر کی جائے کہ فرض و سنت کے درمیان زیادہ فصل نہ ہونے پائے اور اگر ان کے بعد کوئی سنت مشروع نہیں ہے تو نسبتہً اتنی طویل دعا بھی کی جا سکتی ہے جو دوسرے شرکاءِ دعا کیلئے مشقت اور پریشانی کا باعث نہ ہو ——— عالمگیری میں ہے:

الامام اذا فرغ من الظہر والمغرب والعشاء یشرع فی السنۃ ولایشتغل بادعیۃ طویلۃ ؎۳۔

امام ظہر، مغرب اور عشاء سے فارغ ہو تو سنت شروع کرے اور طویل دُعاؤں میں مصروف نہ ہو۔

نوافل کے بعد بھی اگر نماز پڑھنے والے اپنے طور پر دُعا کرلیں تو مضائقہ نہیں لیکن اجتماعی طور پر دوبارہ امام کا دعاء کرنا اور مقتدیوں کا اسی میں شریک ہونا ایک

؎۱ بزازیہ برحاشیہ عالمگیری ۳۷۸/۶۔

؎۲ عالمگیری ۹۱/۴۔

؎۳ عالمگیری ۱/

ایسا عمل ہے جس کا سنت میں کوئی ثبوت نہیں بلکہ بہتر طریقہ تو یہ تھا کہ یہ نفل نماز گھر میں ادا کی جاتی، اس لئے کہ سنن ونوافل کو گھر میں ہی ادا کرنا بہتر ہے۔

الافضل فی السنن والنوافل المنزل لقوله صلوٰة الرجل فی المنزل الافضل الا المکتوبة ۱ؐ

سنن ونوافل نمازوں کے لئے گھر بہتر ہے اسلئے کہ آپؐ نے فرمایا فرائض کے سوا دوسری نمازوں کا آدمی کیلئے گھر میں پڑھنا بہتر ہے۔

اس دعائے ثانیہ اور اس کے رواج والتزام کے باعث ایک تو لوگ اس فضیلت سے محروم رہتے ہیں، دوسرے مسجد میں مصروفِ نماز دوسرے نمازیوں کو اس کی وجہ سے خلل واقع ہوتا ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ خود آپؐ سے اس کا ثبوت نہیں۔ اور جہاں اجتماعی دعا کا ثبوت نہ ہو وہاں اجتماعی دعا درست نہیں۔

اسی لئے فقہاء نے ختمِ قرآن پر اجتماعی جہری دعا کو منع کیا ہے:

ویکرہ الدعاء عند ختم القرآن او بجماعة خارج لانه لم ینقل عن الصحابة قال الصفار ولولا ان اهل البلدة یقولو تمنعنا من الدعاء نمنعهم، والاشتغال بعد الفرض باداء السنة اولیٰ من الدعاء ـــــ المذکر اذا دعا بالدعاء الماثور جهراً وجهر معه القوم ایضاً لیتعلموا الدعاء لا بأس به واذا تعلموا حینئذ یکون جهر القوم بدعة ۲ؐ

رمضان المبارک میں ختمِ قرآن کے وقت دعا یا خارج نماز اجتماعی دعا مکروہ ہے کیونکہ یہ صحابہ سے منقول نہیں، شیخ صفار نے کہا ہے کہ اگر اہلِ شہر یہ نہیں کہتے کہ تم مجھ کو دعا سے روک رہے ہو تو میں ان کو منع کرتا۔ فرض کے بعد سنت کی ادائیگی میں مشغول ہونا دعا کرنے سے زیادہ بہتر ہے ـــــ ـــــ واعظ زور سے دعاءِ ماثور پڑھے اور اس کے ساتھ قوم کے لوگ بھی دعا سیکھنے کی غرض سے زور سے دعا پڑھیں تو کوئی حرج نہیں اور جب وہ دعا سیکھ چکے ہوں تو قوم کو زور سے دعا پڑھنا بدعت ہے۔

✣ ✣ ✣ ✣

۱ؐ عالمگیری ۵۹/۱ ۔ ۲ؐ بزازیہ علی ہامش الہندیہ ۳۸۰/۶ ۔

نیز بزازیہ میں بعض مفسرین سے نقل کیا گیا ہے:

وفی تفسیر الثعالبی لایحب المعتدین بالجھر بالدعاء من الاعتداء فیدل علی کراھۃ وفی اجوبۃ الامام الزاھد الخوارزمی انہ بدعۃ ولا نجیز ولا نمنع [1]

ثعالبی کی تفسیر میں "لایحب المعتدین" کے ذیل میں لکھا ہے کہ زور سے دعا کرنا بھی یعنی زیادتی میں داخل ہے جو اس کے مکروہ ہونے پر دلیل ہے امام زاہدی نے اس کو بدعت قرار دیا ہے ہم نہ ناجائز کہتے ہیں اور نہ منع کرتے ہیں۔

نیز عالمگیری میں ہے:

یکرہ الدعاء عند ختم القرآن بجماعۃ لان ھٰذا لم ینقل عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم [2]

ختم قرآن پر اجتماعی دعا کرنا مکروہ ہے، اسلئے کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے۔

خطبہ میں عصا کا لزوم

خطبہ کا عصا کا استعمال، یہ بھی ان مسائل میں سے ہے جو عموماً عوام میں محلِ نزاع بنا ہوا ہے۔

ابوداؤد میں حضرت براء بن عازب سے نقل کیا گیا ہے کہ آپؐ نے خطبہ کے دوران مدینہ میں لاٹھی یا کمان کا سہارا لیا ہے۔ اس لئے ابن امیر الحاج کا خیال ہے کہ خطبہ میں عصا لینا درست [3] ہے۔ چنانچہ امام شافعی کے نزدیک خطیب کا عصا یا کمان یا کسی اور چیز کا ٹیک لگانا بہتر ہے۔ امام صاحب کا خود کہنا ہے ویعتمد الذی یخطب علی عصا او قوس او ما اشبھھما [4]۔ یہی رائے ابن قدامہ نے حضرت حنابلہ

---

[1] بزازیہ علی ہامش الہندیہ ۳۷۹/۶۔ [2] عالمگیری ۹۲/۴۔

[3] ابوداؤد کی روایت کو طحاوی کے بقول ابن سکن نے صحیح قرار دیا ہے، اس کے علاوہ متعدد ضعیف روایتیں

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

سے نقل کی ہے۔[1]

فقہاء احناف نے اس حدیث کو اس صورت پر محمول کیا ہے جب کہ کوئی علاقہ بزور قوت مسلمانوں کے زیر نگیں آئے، گویا اس کا مقصود اپنی قوت وشوکت اور جاہ و جبروت کا اظہار ہے۔ جو علاقے یونہی مسلمانوں کے زیر اقتدار آئے ہوں وہاں عصا وغیرہ نہیں لیا جائے گا بلکہ عصا کا استعمال مکروہ ہوگا، طحطاوی کہتے ہیں:

وفیه اشارة الی انه یکره الاتکاء علی غیرہ کعصا وقوس[2]

اور اس میں اس بات کی طرف اشارہ کہ دوسری چیز مثلاً لاٹھی اور کمان پر ٹیک لگانا مکروہ ہے۔

اور عالمگیری میں "خلاصہ" اور "محیط" کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے۔

یکرہ ان یخطب متکئاً علی قوس او عصا۔[3]

کمان یا عصا پر ٹیک لگا کر خطبہ دینا مکروہ ہے۔

ہندوستان جیسے ملک میں جہاں اب مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہے ہے احناف کے مسلک کے مطابق عصا کا استعمال مکروہ اور شوافع وحنابلہ کے مسلک پر مسنون ہوگا۔ تاہم اگر سنت کو بھی واجب کا درجہ دیدیا جائے تو وہ بھی بدعت ہو جاتا ہے ——— اس تفصیل سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عصا کے استعمال کا ہندوستان میں کیا حکم ہے؟

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ہیں جو اس کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ حافظ نور الدین ہیثمی نے اس سلسلہ میں چار روایتیں نقل کی ہیں، طبرانی کی عبد اللہ بن زبیر سے جس کی سند میں ابن لہیعہ ہیں، طبرانی ہی کی ابن عباس سے، اس کی سند میں ابو شیبہ ہیں، طبرانی ہی کی سعد القرظ مؤذن رسول اللہؐ سے اور اس کے بارے میں بھی ہیثمی کا فیصلہ ہے "اسنادہ ضعیف" دیکھئے مجمع الزوائد ۲/۱۸۷، باب علی ای شیئ یتکئ (خطیب)

۴ کتاب الام ۱/۲۰۰ آداب الخطبہ۔

(حاشیہ صفحہ ہذا): ۱ ولیستحب ان یعتمد علی قوس او سیف او عصا، المغنی ۲/۷۷ــ۷۵۔

۲ طحطاوی علی مراقی الفلاح ص: ۲۹۹۔

۳ عالمگیری ۱/۸۶۔

فجر اور عصر کے بعد مصافحہ

مصافحہ مسنون ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس سے گناہ جھڑتے ہیں لیکن فجر اور عصر یا جمعہ یا کسی اور نماز کے بعد خصوصیت سے مصافحہ کرنا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ ملا علی قاری لکھتے ہیں:

فان محل المصافحة المشروعة اول الملاقاة وقد يكون جماعة يتلاقون من غير مصافحة ويتصاحبون بالكلام ومذاكرة العلم وغيره مدة مديدة ثم اذا صلوا يتصافحون فاين هذا من السنة المشروعة؟ ولهذا صرح بعض علمائنا بانها مكروهة حينئذ وانها من البدع المذمومة۔[1]

مشروع مصافحہ کی جگہ اول ملاقات ہی، بسا اوقات ایک جماعت بغیر مصافحہ کے ایک دوسرے سے ملتی ہے، طویل وقت تک باہم گفتگو اور علمی مذاکرات میں مصروف رہتی ہے پھر جب نماز پڑھ لیتے ہیں تو ایک دوسرے سے مصافحہ کرتے ہیں، اس کو سنت مشروعہ سے کیا تعلق؟ اسی لئے ہمارے بعض علماء نے صراحت کردی ہے کہ اس موقع پر مصافحہ مکروہ ہے اور بدترین بدعتوں میں سے ہے۔

علامہ شامی اگرچہ کہ اس کو جائز قرار دینے کے درپے ہیں لیکن اس کا اعتراف بھی کرتے ہیں:

واما ما اعتاده الناس من المصافحة بعد صلوٰة الصبح والعصر فلا اصل له فی الشرع علیٰ هذا الوجه، قد يقال ان المواظبة عليها بعد الصلوٰة خاصة قد يؤدی الجهلة الیٰ اعتقاد سنيتها فی خصوص

فجر اور عصر کی نمازوں کے بعد لوگوں میں مصافحہ کا جو رواج ہو گیا ہے شریعت میں اسکی کوئی اصل نہیں ہے، کہا جاتا ہے کہ نماز کے بعد اس کی پابندی جاہلوں میں یہ اعتقاد پیدا کردے گی کہ وہ خاص ان مواقع پر مسنون ہے اگرچہ کہ دوسرے مواقع کے مقابلہ

---

[1] مرقاۃ المفاتیح ۴/۵۶۵۔

هٰذہ المواضع وان خصوصیتہ زائدۃ علیٰ غیرھا مع ان ظاھر کلامھم انہ لم یفعلھا احد من السلف فی ھٰذہ المواضع وکذا قالوا تکرہ المصافحۃ بعد اداء الصلوٰۃ بکل حال لان الصحابۃ ماصافحوا بعد اداء الصلوٰۃ ولانہا :سنن الروافضی بدعۃ مکروھۃ لا اصل لہا فی الشرع وانہ ینبہ فاعلہا انما ھو لقاء المسلم لاخیہ لافی ادبار الصلوٰۃ فحیث وضعہا الشرع بعضہا فینہی عن ذلك ویزجر فاعلہ لما اتی بہ من خلاف السنۃ [1]

اس کی خصوصیت زیادہ ہے، ویسے بظاہر فقہار کے کلام سے معلوم ہے کہ ان مواقع پر سلف سے ایسا کرنا ثابت نہیں، چنانچہ فقہار نے کہا ہے کہ ادا ِر نماز کے بعد بہر حال مصافحہ مکروہ ہے اس لئے کہ صحابہ نے ادا ِر نماز کے بعد مصافحہ نہیں کیا ہے اور اس لئے کہ یہ روافض کا طریقہ اور مکروہ بدعت ہے جس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں، اس لئے ایسا کرنے والوں کی تنبیہ کی جائے گی، اس لئے کہ مصافحہ اپنے بھائی سے ملاقات کے وقت ہے نہ کہ نمازوں کے بعد، لہٰذا ایسا کرنے والے کی تنبیہ کی جائے گی کہ وہ خلافِ سنت کام کر رہا ہے۔

∴ ∴ ∴ ∴ ∴

پھر شامی نے شوافع میں حافظ ابن حجر کا قول نقل کیا ہے کہ یہ بدترین بدعت ہے انہا بدعۃ مکروھۃ لا اصل لہا فی الشرع۔ نیز یہ کہ ایسا کرنے والوں کی پہلے تنبیہ کی جائے گی اور اس کے باوجود نہ مانیں تو ان کی سرزنش کی جائے گی پھر مالکیہ میں ابن الحاج سے نقل کیا گیا کہ یہ بدعت ہے اور ایسا کرنے والوں کی سزا کی جائے گی۔ انہا من البدع ..... ویزجر فاعلہ لما اتی بہ من خلاف السنۃ [2]۔

اس لئے اس میں شبہ نہیں کہ یہ مروجہ مصافحہ از قبیل بدعات ہی ہے!

---

[1] ردالمحتار ۵/۲۴۴۔

[2] حوالۂ سابق۔

ترویحہ میں جہری اجتماعی تسبیح

نمازِ تراویح چونکہ رکعات کی کثرت کی وجہ سے تھکن اور مشقت کا باعث بن جاتی ہے اس لئے ہر چار رکعت پر "ترویحہ" کے نام سے ایک وقفہ رکھا گیا ہے تاکہ نمازیوں کو راحت کا ایک موقع میسر آجائے۔ اس حالت میں کیا کیا جائے؟

عالمگیری کا بیان ہے:

ثم ھم یختار فی حالۃ الجلوس ان شاء سبحوا وان شاء واقعدوا ساکتین، اھل مکۃ یطوفون اسبوعاً ویصلون رکعتین واھل المدینۃ یصلون اربع رکعات فرادیٰ[1]

پھر تراویح پڑھنے والے بیٹھنے کی حالت میں مختار ہیں چاہیں تو تسبیح پڑھیں یا خاموش بیٹھے رہیں، اہلِ مکہ طواف کرتے اور دو رکعت نماز پڑھتے تھے اور اہلِ مدینہ تنہا تنہا چار چار رکعت نفل پڑھا کرتے تھے۔

غرض اس وقفہ میں تسبیح پڑھے یا خاموش رہے، مکہ میں ہو تو خانۂ کعبہ کا طواف کرے یا نفل نماز پڑھے جو جماعت کے ساتھ نہ ہو، البتہ امام احمد کے پاس نفل نماز پڑھنا مکروہ ہے یکرہ التطوع بین التراویح[2] —— یہ جتنے اعمال کا ذکر کیا گیا ہے سبھی انفرادی ہیں، اجتماعی عمل کی ایک ہی صورت تھی کہ نفل باجماعت ادا کی جاتی سو اس سے منع کر دیا گیا اور "فرادیٰ" کی قید لگائی گئی، تسبیح تو انفرادی عمل ہی ہے جسے آہستہ پڑھا جائے گا، عام حالات میں بھی اس کو زور سے ادا کرنا مکروہ ہے، اسلئے کہ تسبیح از قبیلِ ذکر ہے اور ذکر کے متعلق فقہاء کا فیصلہ ہے: رفع الصوت بالذکر حرام[3] —— اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تراویح

---

[1] عالمگیری ۱/۶۰۔ [2] المغنی ۱/۴۵۷۔

[3] ذکر کو بلند آواز کرنا حرام ہے، بزازیہ

کے درمیان بلند آواز کے ساتھ اجتماعی ذکر کا کیا درجہ ہے؟

جنازہ کے ساتھ بہ آواز بلند تسبیح

جنازہ کے گذرنے کا وقت، عبرت و موعظت کا وقت ہے، اس وقت خاموشی کے ساتھ جنازہ میں شریک رہے اور اپنے ذہن میں موت اور آخرت کا استحضار کرے، اگر کچھ ذکر کرنا چاہے تو آہستہ آہستہ کرے، بلند آواز سے نہ اذکار پڑھے نہ قرآن مجید کی تلاوت کرے بلکہ بقول طحطاوی کے جو اس کیفیت سے روکنے پر قادر ہو اس کے لئے اس پر خاموشی اختیار کرنا بھی جائز نہیں ———

ملاحظہ ہو: ———

ویستحب لمن تبع الجنازة ان یکون مشغولا بذکر اللہ ای سرا والتفکر فی ما یلقاه المیت وان ھذا عاقبة اھل الدنیا ولیحذر عما لا فائدة فیہ من الکلام وان ھذا وقت ذکر وموعظة فتقبح فیہ الغفلة فان لم یذکر اللہ تعالیٰ فلیلزم الصمت ولا یرفع صوتہ بالقراءة ولا بالذکر ولا یغتر بکثرة من یفعل ذلك واما ما یفعل الجھال فی القراءة علی الجنازة من رفع الصوت والتمطیط فیہ فلا یجوز بالاجماع ولا یسع احداً

جنازہ کے پیچھے چلنے والوں کے لئے مستحب یہ ہے کہ آہستہ آہستہ اللہ کے ذکر میں مشغول رہے اور میت کو پیش آنے والے اور اہلِ دنیا کے انجام پر غور کرتا رہے اور بے فائدہ باتوں سے بچتا رہے کہ یہ پند و موعظت کا وقت ہے جس میں بڑے بڑوں کا حال بگڑ جاتا ہے۔ پس اگر اللہ کا ذکر نہ کرے تو خاموش رہے اور ذکر و قرأت میں آواز بلند نہ کرے اور ایسا کرنے والوں کی کثرت کی وجہ سے دھوکہ نہ کھائے، جنازہ پر بآوازِ بلند پڑھنے کا جو عمل جاہل کرتے ہیں یہ بالاجماع جائز نہیں اور نہ کسی ایسے شخص کے لئے جو اس پر اظہارِ ناپسندیدگی کرنے

يقدر على انكاره ان يسكت عنه ولا ينكر عليه۔[1] — پر قادر ہو اس پر خاموش رہنا اور اظہار ناپسندیدگی سے گریز کرنا جائز ہے۔

یہی بات علامہ شامی نے لکھی ہے، درمختار کی عبارت کہ جنازہ میں بلند آواز سے تلاوت اور ذکر مکروہ ہے وكره فيها رفع الصوت بذكر او قراءة کی تشریح کرتے ہوئے "البحر الرائق" سے نقل کرتے ہیں:

وينبغى لمن تبع الجنازة ان يطيل الصمت وفيه عن الظهيرة فان اراد ان يذكر الله تعالى يذكره فى نفسه لقوله تعالى انه لا يحب المعتدين اى المجاهرين بالدعاء[2] — جنازہ کے پیچھے چلنے والے کیلئے مناسب ہے کہ طویل خاموشی اختیار کرے اور اس میں ظہیریہ سے منقول ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا چاہے۔ تو آہستہ کرے اس ارشادِ خداوندی کی وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے یعنی زور زور سے دُعا کرنے والوں کو۔

پس ہمارے زمانہ میں جنازہ کے ساتھ گذرتے ہوئے باآواز بلند بلکہ راگ کے ساتھ ذکر و تسبیح کا جو رواج پڑگیا ہے اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

قبر پر اذان

اذان ایک عبادت ہے اور اسی موقع پر دی جاسکتی ہے جہاں سنت سے ثابت ہو، اسی لئے جنازہ، عیدین اور نوافل وغیرہ کے لئے بالاتفاق اذان نہیں دی جاسکتی کہ یہ سنت سے ثابت نہیں ہے، موت کے بعد اگر اذان دی جاتی تو نماز سے پہلے اس نماز کے لئے دی جاتی مگر ایسا نہیں کیا جاتا کہ شریعت میں اس کی کوئی اصل

---

[1] طحطاوی علی مراقی الفلاح ص ۲۵۳

[2] ردالمحتار، باب الجنائز ۱/

اصل نہیں ہے، ————— پس چونکہ میت کو قبر میں داخل کرتے وقت بھی اذان دینی ثابت نہیں اس لئے یہ عمل بھی بدعت ہوگا،

علامہ ابن عابدین شامی فرماتے ہیں :

لایسن الاذان عند ادخال المیت۔ میّت کو قبر میں داخل کرنے کے وقت اذان مسنون نہیں ہے۔

اور حافظ ابن حجر شافعی جو بڑے بلند پایہ فقہاء و محدثین میں ہیں، کا فتویٰ نقل کرتے ہیں :

قد صرح ابن حجر فی فتاواہ بانہ بدعۃ[1] ابن حجر نے اپنے فتاویٰ میں صراحت کی ہیکہ یہ بدعت ہے

نمازِ جنازہ کے بعد دُعار

نمازِ جنازہ کے بعد دوبارہ دعار کا رواج سا ہوگیا ہے اور لوگ اسکو ضروری سمجھتے ہیں، حالانکہ نمازِ جنازہ بجائے خود دعار ہے۔ قرآن و حدیث سے یہ دعار ثابت نہیں ہے، اسی طرح نمازِ جنازہ سے پہلے قرآن مجید کی تلاوت یا اس کے بعد مروّجہ طور پر تلاوت اور دُعا بھی شرعاً ثابت نہیں ہے۔ صاحبِ خلاصۃ الفتاویٰ لکھتے ہیں:

لایقوم بالدعاء فی قراءۃ القرآن الجنازۃ ولایقوم بالدعاء فی قراءۃ القرآن لاجل المیت بعد صلوٰۃ الجنازۃ وقبلہا[2] نمازِ جنازہ کے بعد پھر دعار کے لئے نہ کھڑا ہو اور نہ نمازِ جنازہ سے پہلے یا اس کے بعد قراءتِ قرآن کے ساتھ دعا کی جائے۔

علامہ ابن نجیم مصری لکھتے ہیں :

کرہ ان یقوم رجل بعد ما اجتمع القوم للصلوٰۃ ویدعو للمیت ویرفع لوگ نمازِ جنازہ کے لئے جمع ہوں تو اس موقع پر ایک شخص کا کھڑا ہو کر زور زور سے آوازِ بلند

---

[1] ردالمحتار ۱/۶۵۹۔

[2] جلد ۱ ص ۲۲۵ ۔

صوتہ[1] دعا کرنا مکروہ ہے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں:

ولا یدعو للمیت بعد صلوٰۃ الجنازۃ لانہ یشبہ الزیادۃ فی صلوٰۃ الجنازۃ[2]

نماز جنازہ کے بعد مردہ کے لئے الگ دعا نہ کرے کہ اس سے نمازِ جنازہ میں اضافہ کا شبہ پیدا ہوتا ہے۔

ہاں البتہ تدفین کے بعد کچھ دیر تک ٹھہرنا، تلاوت کرنا اور مردہ کے لئے دعا کرنا درست ہے۔

ویستحب اذا دفن المیت ان یجلسوا ساعۃ عند القبر بعد الفراغ بقدر ما ینحر جزور ویقسم لحمہا یتلون القرآن ویدعون للمیت[3]

تدفین کے بعد اونٹ کے ذبح کرنے اور اس کا گوشت تقسیم کرنے کے بقدر قبر پر لوگوں کا بیٹھنا قرآن مجید کی تلاوت کرنا اور میت کے لئے دعا کرنا مستحب ہے۔

قبر پر ختمِ قرآن کرانا

قبر پر کسی حافظِ قرآن یا کسی اور کو بٹھا کر تلاوتِ قرآن کرانا امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک درست نہیں البتہ امام محمدؒ نے اجازت دی ہے:

رجل اجلس علیٰ قبر اخیہ رجلاً یقرأ القرآن یکرہ عند ابی حنیفۃ و عند محمد لا یکرہ[4]

ایک شخص کسی کو اپنے بھائی کی قبر پر بٹھائے کہ وہ قرآنِ مجید پڑھے تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مکروہ ہے اور امام محمد کے نزدیک نہیں۔

---

[1] البحر الرائق ٢١٩/٥۔

[2] مرقاۃ المفاتیح ٢١٩/٢۔

[3] عالمگیری ٨٥/١۔

[4] خلاصۃ ٢٢٤/١۔

پھر جن حضرات نے اجازت دی ہے ان کے یہاں بھی حدود و قیود اور شرائط و آداب کی تعیین میں اختلاف ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ پست آواز میں پڑھے، بلند آواز کے ساتھ پڑھنا درست نہیں، یہ رائے محمد بن فضل سے نقل کی گئی ہے ان قراءۃ القرآن فی المقابر اذا اخفی ولم یجہر لا یکرہ ولا بأس بہا انما یکرہ قراءۃ القرآن فی المقبرۃ جہراً اما المخافۃ فلا بأس بہا وان ختم۔

ابو بکر محمد بن ابراہیم کا خیال ہے کہ صرف سورۂ "ملک" کا پڑھنا درست ہے زور سے پڑھے یا آہستہ، دوسری سورتوں اور آیات کا پڑھنا جائز نہیں لا بأس ان یقرأ علی المقابر سورۃ الملک سواء اخفی او جہر واما غیرہا فانہ لا یقرأ فی المقابر ولم یفرق بین الجہر والخفیۃ۔

فتاویٰ قاضی خاں میں ہے کہ مدفون کو قرآن مجید کی آواز سے مانوس کرنا مقصود ہے تو مضائقہ نہیں، لیکن اگر محض ایصالِ ثواب اور اللہ کو سنانا مقصود ہے تو قبر پر پڑھنے کی حاجت نہیں کہ جہاں کہیں بھی پڑھے یہ مقصد حاصل ہو جائیگا وان قرأ القرآن عند القبور ان نوی بذلک ان یونسہ صوت القرآن فانہ یقرأ وان لم یقصد ذلک فاللہ تعالیٰ یسمع قراءۃ القرآن حیث کانت [1]

تاہم اس بات سے قطعِ نظر کہ قرآن مجید کی تلاوت قبرستان میں جائز ہے یا نہیں؟ اور درست ہے تو کن شرطوں اور حدوں کے ساتھ؟ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ سب اس وقت ہے جب کہ قرآن مجید پڑھنے والا بلا معاوضہ اخلاص کے ساتھ ایصالِ ثواب کی نیت سے قرآنِ مجید کی تلاوت کرے، معاوضہ اور اجرت لے کر نہ تلاوت کرنا جائز ہے نہ اس کے ذریعہ ایصالِ ثواب ہوتا ہے اور نہ اس طرح تلاوت کرانا جائز، بلکہ دونوں گنہگار ہوں گے اور ثواب بھی مردہ

[1] عالمگیری ۱۰۹/۴۔

نہیں پہونچ سکے گا ———— ملاحظہ ہو:

ولا یصح الاستیجار علی القرأة واهداءها الی المیت لانه لم ینقل عن احد من الائمة الاذن فی ذٰلك وقد قال العلماء ان القاری اذا قرأ لاجل المال فلا ثواب له فای شیئ یهدیه الی المیت [1]

تلاوت کے لئے اجرت رکھنا اور اس کا میت کو ایصال کرنا درست نہیں اس لئے کہ کسی امام سے اس کی اجازت منقول نہیں، علماء نے لکھا ہے کہ قاری جب اجرت کے لئے پڑھے تو اس کے لئے ثواب نہیں پھر وہ میت کو کیا ایصال کرے گا۔

اور بدقسمتی سے ہمارے زمانہ میں قبر پر ختم قرآنِ مجید کی یہی شکل رائج ہے جس کے غیر درست ہونے پر تمام ائمہ واہل علم کا اتفاق ہے۔

چادر چڑھانا

رسول اللہؐ یا آپؐ کے صحابہ سے کسی قبر پر چادر چڑھانا ثابت نہیں اسلئے بلاشبہ قبروں پر چادر چڑھانا جائز نہیں اور بدعت ہے۔

کرہ بعض الفقهاء وضع الستور والعمائم والثیاب علی قبر الصالحین والاولیاء قال فی فتاوی الحجة وتکره الستور علی القبور [2]

فقہاء نے صالحین اور بزرگوں کی قبروں پر کپڑے، عمامے اور چادر چڑھانے کو مکروہ قرار دیا ہے۔ فتاویٰ حجہ میں بھی قبروں پر چادر چڑھانے کو مکروہ قرار دیا گیا ہے۔

مجالس الابرارؒ میں ان امور کا ذکر کرتے ہوئے جو مسلمانوں کے تمام ائمہ کے یہاں بالاتفاق ناجائز ہیں، لکھا ہے: تعلیق الستور علیها [3]

---

[1] مجموعۃ الرسائل ص۱۷۵۔

[2] ردالمحتار ۲۳۲/۵۔ [3] ص۱۱۵۔

قبر کا طواف، بوسہ، چراغاں

سجدہ عبادت ہے، اس لئے قبروں کے سامنے سجدہ صریحاً شرک اور توحید کے منافی ہے، بیت اللہ شریف کے علاوہ کسی اور جگہ کا طواف جائز نہیں، اس لئے کہ طواف بھی عبادت ہے جو اس کے گھر کے سوا کسی اور جگہ کے لئے زیبا نہیں، اس لئے قبروں کا طواف اور اس کے پھیرے لگانا بھی حرام ہے، قبروں پر چراغاں کرنا (چاہے موجودہ زمانہ میں بجلی کی روشنی یا قمقموں کی صورت میں ہو) ناجائز ہے۔ خود آپؐ نے صراحۃً اس سے منع فرمایا ہے، قبروں پر سال بھر میں ایک دفعہ جمع ہونا اور عرس منانا کتاب و سنت سے ثابت نہیں، اس لئے بدعت اور قطعاً بے اصل ہے۔

اس سلسلہ میں فقہائے کرام کی تصریحات ملاحظہ فرمائی جائیں۔

تفسیر مظہری میں ہے:

لایجوز مایفعله الجهال بقبور الاولیاء والشهداء من السجود والطواف حولها واتخاذ السروج اليها ومن اجتماع بعد الحول كالعياد ويسمونه عرساً[1]	جہلاء اولیاء و شہداء کی قبروں پر جو سجدہ و طواف، چراغاں اور سالانہ عرس وغیرہ کرتے ہیں وہ جائز نہیں۔

قبروں پر چراغ جلانے اور چراغاں کرنے کی بابت فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

وایقاد النار علی القبور فمن رسوم الجاهلية والباطل والغرور[2]	قبروں پر آگ روشن کرنا جاہلانہ رسوم اور باطل طریقوں میں سے ہے۔

---

[1] جلد ۲ صفحہ ۶۵۔ [2] جلد ۱ صفحہ ۸۶۔

واخراج الشموع الی رأس القبور فی اللیالی الاولیٰ بدعة [1]	ابتدائی راتوں میں قبروں پر چراغ جلانا بدعت ہے۔

اور کیونکر نہ ہو کہ خود رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو سجدہ گاہ بنانے اور ان پر چراغ جلانے سے منع فرمایا ہے:

لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زائرات القبور والمتخذین علیہا المساجد والسروج [2]	آپ نے قبر کی زیارت کرنیوالی خواتین، نیز قبروں پر مسجد بنانے والوں اور چراغاں کرنے والوں پر لعنت فرمائی ہے۔

ملا علی قاری قبروں پر چراغاں کئے جانے کی ممانعت کی حکمت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

النہی عن اتخاذ السرج اما لما فیہ من تضییع المال لانہ لا نفع لاحد من السراج ولانہا من آثار جہنم واما للاحتراز عن تعظیم القبور کالنہی عن اتخاذ القبور مساجد [3]	قبروں پر چراغاں جلانے کی ممانعت، سو وہ اسلئے کہ اس میں تضییعِ مال ہے کیونکہ اس چراغ سے کوئی فائدہ نہیں اور اس لئے کہ یہ دوزخ کے آثار میں سے ہے اور اس لئے کہ قبروں کے احترام سے بچا جائے جیسا کہ قبروں کو مسجد بنائے جانے سے منع کیا گیا ہے۔

یہی حال قبروں کا بوسہ لینے کا ہے، فقہاء نے اس سے منع کیا ہے ہاں بعض لوگوں نے والدین کی قبر کو بوسہ لینے کی اجازت دی ہے۔

ولا یمسح القبر ولا یقبلہ فان ذٰلک من عادۃ النصاریٰ ولا بأس بتقبیل قبر والدیہ [4]	نہ قبر کو چھوا جائے، نہ اس کا بوسہ لیا جائے کہ یہ عیسائیوں کی عادت ہے، ہاں والدین کی قبر کو چومنے میں مضائقہ نہیں۔

---

[1] عالمگیری ۴/۱۱۰۔ [2] ابوداؤد عن ابن عباس۔

[3] عالمگیری ۴/۱۱۰۔ [4] مرقاۃ المفاتیح ۱/۴۷۰۔

قبر پر چادر اور پھول چڑھانا

خانہ کعبہ کے سوا کسی تعمیر پر غلاف چڑھانا ثابت نہیں، اسی لئے فقہاء نے بھی اس سے منع کیا ہے، علامہ شامی لکھتے ہیں:

یکرہ الستور علی القبور — قبروں پر چادر چڑھانا مکروہ ہے۔[۱]

اس میں شبہ نہیں کہ بعض فقہاء نے قبروں پر پھول یا سبز و تازہ ٹہنی ڈالنے کی اجازت دی ہے اس لئے کہ خود رسول اللہؐ نے دو ایسے شخصوں کی قبر پر جو مبتلائے عذاب تھے، تخفیفِ عذاب کے لئے ایک ٹہنی کے دو ٹکرے کرکے رکھدئے تھے، چنانچہ طحطاوی لکھتے ہیں:

وقد افتی بعض الائمۃ من متأخری اصحابنا بان ما اعتید من وضع الریحان والجرید سنۃ لھذا الحدیث[۲] — بعض متأخرین فقہاء نے فتویٰ دیا ہے کہ پھول اور ٹہنیاں قبر پر رکھنے کا جو رواج ہے وہ اس حدیث سے ثابت ہے۔

عالمگیری میں بھی "غرائب" سے نقل کیا ہے کہ گلاب کے پھول اور دوسرے پھول جو قبر پر رکھے جاتے ہیں ان کا رکھنا درست ہے لیکن اگر ان کی قیمت صدقہ کردی جائے تو زیادہ بہتر ہے:

وضع الورد والریاحین علی القبور حسن وان تصدق بقیمۃ الورد کان احسن[۳]۔ — قبروں پر گلاب اور پھول رکھنا بہتر ہے اور اسکی قیمت کا صدقہ کردینا زیادہ بہتر ہے۔

۱۔ ردالمحتار ۱/۸۳۹۔

۲۔ طحطاوی علی مراقی الفلاح ص ۲۶۴۔

۳۔ عالمگیری ۴/۱۱۰۔

مگر یہاں چند باتیں قابلِ غور ہیں:

اول یہ کہ حضورؐ سے اس طرح کا صرف ایک واقعہ منقول ہے، عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں اس کا عام تعامل نہیں تھا، اس سے ان شارحینِ حدیث کی رائے کو تقویت پہونچتی جو اس کو آپؐ کے خصائص میں شمار کرتے ہیں، اگر اس کو مان لیا جائے تو دوسروں کے لئے اس عمل کا جواز باقی نہیں رہتا۔

دوسرے ہمارے زمانہ میں یہ کافروں کا طریق ہوگیا ہے اور یہ عموماً مردوں کی لاشوں اور قبروں (سمادھیوں) پر پھول کی چادریں اور خود پھول چڑھاتے ہیں اور یہ بات متفق علیہ ہے کہ امور دین اور طور وطریق میں کفار کے تشبہ سے بچنے کی سخت تاکید فرمائی گئی ہے اور ایسا کرنا واجب ہے۔

تیسرے یہ پھول ان لوگوں پر چڑھائے جانے چاہئیں جن کی زندگی کے عام حالات کے پیشِ نظر غالب گمان اس کے گنہگار ہونے اور قوی اندیشہ اس کے بارے میں مبتلاءِ عذاب ہونے کا ہے، جیسے "شرابی" جواری، سود خوار وغیرہ مگر عوام عموماً یہ پھول ان کی قبروں پر چڑھاتے ہیں جن کے بارے میں اولیاء اللہ ہونے کا حسنِ ظن رکھتے ہیں ——— اب ظاہر ہے کہ ان کی قبروں پر پھول چڑھانا ان کے بارے میں بدگمانی ہے اور اس بات کی توقع ظاہر کرنا ہے کہ وہ عذابِ خداوندی میں مبتلا ہیں، جو بڑی گستاخی اور انکے ساتھ حد درجہ توہین آمیز سلوک ہے۔

اسی لئے کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے زمانہ میں پھول چڑھانا مطلق مکروہ اور ناجائز ہے۔

قبر پر پختہ عمارت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر پر تعمیر اور اس کو پختہ کرنے سے شدت سے منع فرمایا ہے۔ حضرت علیؓ کو ایک بار آپؐ نے خاص طور پر اس پر مامور فرمایا کہ وہ نمایاں قبروں کو مسطح کردیں۔ اس لئے فقہاء نے اس قسم کے اعمال کو مکروہ قرار دیا ہے۔

فان کتب علیہ شیئ او وضع الاحجار فلا بأس بہ عند البعض ولا یجصص القبر ولا یطین ولا یرفع علیہ بناء ۱؎	قبر پر کچھ لکھنے یا پتھر لگانے میں بعضوں کے نزدیک مضائقہ نہیں، البتہ قبر پختہ نہ بنائی جائے، نہ اس کو مٹی سے لیپا جائے اور نہ اس پر عمارت تعمیر کی جائے۔

تنہا کسی ایک شخص کی قبر پر عمارت بنانا تو مکروہ ہے ہی، اجتماعی مقبرہ پر بھی عمارت کی تعمیر جائز نہیں:

ولو اتخذ کاشانہ لیدفن فیہا موتی کثیرۃ یکرہ ایضاً لان البناء علی المقابر یکرہ ۲؎	اگر کاشانہ بنایا کہ اس میں بہت سے مردے دفن کئے جائیں تو یہ بھی مکروہ ہے۔ اس لئے کہ قبر پر تعمیر مکروہ ہے۔

پہلے بنی ہوئی عمارت میں تدفین بھی جائز نہیں، صاحب مراقی الفلاح کا بیان ہے:

یکرہ الدفن فی الاماکن التی تسمی الفساقی وھی کبیت متعدد بالبناء۔	ایسی جگہوں میں دفن کرنا مکروہ ہے جن کو "فساقی" کہتے ہیں اور وہ متعدد گھروں کے حکم میں ہے تعمیر کی وجہ سے۔

۱؎ خلاصۃ ۱/۲۲۶۔ ۲؎ الفتاویٰ الہندیہ ۴/۱۱۰۔

علامہ طحطاوی نے اس ممانعت کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

الرابع تجصیصہا والبناء علیہا [1]	چوتھی وجہ اس کو پختہ بنانا اور اس پر عمارت تعمیر کرنا ہے۔

لیکن اگر کہیں پہلے سے قبر پر گنبد اور عمارت وغیرہ بنی ہوئی ہے تو احیاءِ سنت کے لئے اس کو منہدم کر دینا درست ہوگا یا نہیں؟ ——— اس پر بڑی اچھی روشنی مشہور مفسر قرآن سید محمد آلوسی نے ڈالی ہے اور مسجدِ ضرار کے واقعہ سے استدلال کیا ہے، آپ اس کو انہیں کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

تجب المبادرۃ الی ھدم القباب التی علی القبور اذ ھی اھون من مسجد الضرار لانہا اسست علی معصیۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم [2]	قبروں کے گنبدوں کو منہدم کرنا واجب ہے اسلئے کہ حضورؐ کی مخالفت اور اس کی نافرمانی پر اس کی بنیاد ہے۔ اس لئے یہ مسجدِ ضرار سے زیادہ انہدام کی مستحق ہے۔

نیز "مجالس الابرار" میں ہے:

القباب التی بنیت علی القبور یجب ھدمہا لانہا اسست علی معصیۃ الرسولؐ ومخالفتہ فھو بالھدم اولیٰ من مسجد الضرار [3]	قبروں کے گنبد منہدم کرنا واجب ہے اس لئے کہ حضورؐ کی مخالفت اور نافرمانی پر اس کی بنیاد ہے اس لئے یہ مسجد ضرار سے زیادہ انہدام کی مستحق ہے۔

غرض ——— ایسے گنبدوں اور تعمیرات کو منہدم کرنا جائز بلکہ بہ شرطِ قدرت واجب ہے۔

---

[1] طحطاوی مراقی الفلاح ص ۳۵۷۔

[2] روح المعانی ۱۵/۲۳۸۔

[3] ص ۱۲۹

سوم و چہلم

موت کے بعد "سوم" اور "چہلم" کا رواج جو ہمارے سماج میں ہے اور جس میں اکثر اوقات ان لوگوں کی شرکت بھی ہو جاتی ہے جن کو اہل دین و تقویٰ سمجھا جاتا ہے، بالکل غیر شرعی اور خلافِ کتاب و سنت ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

ولا یباح اتخاذ الضیافة ثلاثة ایام کذا فی التاتارخانیه [1]	موت کے تیسرے دن ضیافت کا اہتمام جائز نہیں۔

ملا علی قاری لکھتے ہیں:

قرر اصحاب المذهب انه یکره اتخاذ الطعام فی الیوم الاول والثالث وبعد الاسبوع [2]	اصحاب مذہب نے ثابت کیا ہے کہ پہلے تیسرے دن اور ایک ہفتہ کے بعد ضیافت کا اہتمام مکروہ ہے۔

اسی طرح تعزیت کی ایسی مجلسیں جس میں آنے والوں کے لئے کھانے کا اہتمام بھی ہو، کراہت سے خالی نہیں۔ حضرت جعفرؓ کی وفات کے موقع سے آپؐ نے ان کے اہلِ خانہ کے لئے کھانے بنوائے، ان کی تشریح کرتے ہوئے ملا علی قاری لکھتے ہیں:

واصطناع اهل البیت له لاجل اجتماع الناس علیه بدعة مکروهة	میت کے اہلِ خانہ کا لوگوں کے اجتماع کیلئے کھانا بنانا مکروہ بدعت ہے، بلکہ صحیح طور پر

---

[1] فتاویٰ عالمگیری ۱/۸۶۔

[2] مرقاۃ المفاتیح ۵/۴۸۳۔

بل صح عن جویریۃ کنا نعدہ من النیاحۃ وھو ظاھر فی التحریم قال الغزالی ویکرہ الاکل منہ وھذا اذا لم یکن من مال الیتیم او الغائب والا فھو حرام بخلاف ۔ [۱]

ثابت ہے کہ ہم لوگ ایسا نوحہ کرنے والوں کے لئے (جاہلیت) میں کیا کرتے تھے اور اس کا حرام ہونا ظاہر ہے، امام غزالی نے کہا ہے کہ اگر یتیم یا کسی غیر موجود وارث کا مال اس میں شریک نہ ہو تو اس دعوت میں کھانا مکروہ ورنہ حرام ہے۔

مشہور حنفی فقیہہ علامہ ابراہیم حلبیؒ فرماتے ہیں:

ویکرہ اتخاذ الطعام فی الیوم الاول والثالث وبعد الاسبوع ونقل الطعام الی القبر فی المواسم واتخاذ الدعوۃ بقرأۃ القرآن وجمع الصلحاء والقراء للختم او لقراءۃ سورۃ الانعام او الاخلاص

پہلے دن، تیسرے دن اور ایک ہفتہ پر کھانا بنانا، قبر پر خصوصی مواقع پر کھانے کا لے جانا قرآن خوانی کے لئے دعوت کا اہتمام کرنا صالحین اور حفاظ و قراء کو ختم قرآن کے لئے جمع کرنا یا سورۂ انعام اور سورۂ اخلاص پڑھنے کے لئے جمع کرنا، مکروہ ہے۔ (۲)

علامہ طحطاوی حنفی لکھتے ہیں:

وتکرہ ضیافۃ من اھل المیت لانھا شرعت فی السرور لا فی الشرور وھی بدعۃ مستقبحۃ [۳]

اہلِ میت کی طرف سے ضیافت مکروہ ہے اس لئے کہ یہ مواقع خوشی کے لئے ہے نہ کہ مواقعِ غم کے لئے اور یہ بدترین بدعت ہے۔

۱۔ مرقاۃ المفاتیح: ۲/۲۹۳۔
۲۔ کبیری: ۵۶۵
۳۔ طحطاوی علی مراقی الفلاح: ۳۳۹

اور چونکہ یہ "دعوت" بدعت پر مبنی ہے، اس لئے ایسی دعوت قبول بھی نہیں کرنی چاہیئے:

ولو دعی الیٰ دعوة فالواجب ان یجیبه اذا لم یکن هناك معصیة ولا بدعة وان لم یجبه کان عاصیاً والامتناع اسلم فی زماننا الا اذا یعلم یقیناً۔ [۱]

دعوت کو قبول کرنا واجب ہے جب کہ وہاں کوئی گناہ نہ ہو اور نہ بدعت ہو اگر قبول نہ کرے تو گنہگار ہوگا لیکن ہمارے زمانے میں دعوتوں میں شرکت سے رکنا ہی قرینِ احتیاط ہے سوائے اس کے کہ یقینی طور پر اس میں کسی امر مکروہ کے نہ ہونے کا علم ہو جائے۔

قرآن خوانی اور ختمِ قرآن

اجتماعی قرآن خوانی میں ـــــ جہاں ہر شخص زور زور سے قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہے ـــــ قرآن مجید کی بے ادبی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ تلاوتِ قرآن کے وقت دوسرے لوگوں کے لئے خاموش رہنا واجب ہے اور اس کی طرف متوجہ رہنا واجب ہے۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

یکره للقوم ان یقرأ القرآن فی جملة لتضمنها ترك الاستماع والانصاف المامور بها کذا فی القضیة [۲]

لوگوں کے لئے ایک ساتھ مل کر قرآن خوانی کرنا مکروہ ہے کیونکہ اس سے استماع اور انصاف کے حکم کی تعمیل نہیں ہوتی۔

ختمِ قرآنِ مجید کے بعد اجتماعی دعا بھی درست نہیں ـــــ رسول ختمی نبوت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا کرنا منقول نہیں ہے۔

---

[۱]

[۲] عالمگیری ۴/۹۱۔

یکرہ الدعاء عند ختم القرآن بجماعۃ لان هٰذا لم ینقل عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم[1]

ختم قرآن پر جماعت کے ساتھ دعا مکروہ ہے کیونکہ ایسا کرنا آپؐ سے منقول نہیں ہے۔

اس میں جو لوگ روپے لیکر اور دعوت کی حرص میں قرآن مجید پڑھنے جاتے ہیں ان کا عمل بھی درست نہیں ہے۔

لو قرأ طمعاً فی الدنیا فی المجالس یکرہ[2]

مجلسوں میں دنیا کی حرص میں قرأتِ قرآن مکروہ ہے۔

اجرت لیکر ایصالِ ثواب

آج کل کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو پیسے لیتے ہیں اور قرآن مجید کی تلاوت کر کے ایصالِ ثواب کرتے ہیں، نقد شکل میں روپے نہ لیں تو بھی ان کیلئے "کھانا" اس قدر ضروری ہے کہ اس کی تعین کی بھی ضرورت نہیں ہے، یہ شکل بالکل ناجائز اور حرام ہے اور آیاتِ قرآنی کو بیچنے کے مرادف ہے اور اس کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس طرح قرآن مجید کی تلاوت بجائے خود "ثواب" کا کام نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس تلاوت میں اخلاص باقی نہیں رہا اور جو کام اخلاص کے بغیر ہو اس میں ثواب نہیں اور جب اس پر کوئی ثواب ہی نہیں ہے تو ظاہر ہے مردہ تک "ثواب" کا ایصال کیونکر ہوگا؟ ——— علامہ شامی لکھتے ہیں:

قال تاج الشریعۃ فی شرح الهدایہ ان القرآن بالاجرۃ لایستحق الثواب لا للمیت ولا للقاری وقال العینی فی شرح

تاج الشریعہ نے شرح ہدایہ میں اجرت لے کر قرآن کی تلاوت کو مکروہ قرار دیا ہے جس پر کوئی ثواب نہ ہوگا نہ میت کو اور نہ قاری کو اور عینی نے شرح ہدایہ میں لکھا

---

[1] عالمگیری ۴/۹۱۔

[2] ایضاً السابق۔

الهدایہ یمنع القاری للدنیا والآخذ والمعطی اٰثمان [1] | ہے کہ دنیا کیلئے اس طرح تلاوت کرنے والے کو روکا جائے گا اور لینے اور دینے والا دونوں گنہگار ہوں گے۔

بریلوی مکتبِ فکر کے مشہور عالم مولانا حکیم امجد علی رضوی لکھتے ہیں:

"بعض دفعہ پڑھنے والوں کو پیسے نہیں دیئے جاتے مگر ختم کرنے کے بعد مٹھائی تقسیم ہوتی ہے، اگر اس مٹھائی کی خاطر تلاوت کی ہے تو یہ بھی ایک قسم کی اجرت ہے کہ جب ایک چیز مشہور ہو جاتی ہے تو اسے مشروط ہی کا حکم دیا جاتا ہے اس لئے اس کا بھی وہی حکم ہوا جو مذکور ہو چکا، یعنی جس طرح اجرت نقد کی صورت میں لینا دینا حرام ہے اسی طرح مٹھائی بھی لینا دینا حرام ہے۔ اگرچہ قرآن شریف پڑھنے سے پہلے مقرر نہ کیا جائے لیکن جس چیز کی رسم پڑ جاتی ہے اس کے متعلق یقین ہو جاتا ہے کہ ضرور ملے گی، اس لئے یہ مٹھائی بھی حرام ہے" [2]

ختم شد

---

[1] ردالمحتار ۳۵/۵۔

[2] بہارِ شریعت ۲۴۰/۱۹۔


نبیوں کی سچی کہانیاں